کاروان و منزل

امن لکھنوی



سنگم کتاب گھر

اردو بازار دہلی

بار اوّل ——— دسمبر ——— ۱۹۵۰ء

۱۰۰۰

قیمت مجلد ...... عہ

باہتمام لالہ شمبھو ناتھ صاحب

دلی پرنٹنگ ورکس

دہلی

فہرست عنوانات

پیش لفظ

(پروفیسر راجندر ناتھ شیدا ایم - اے)

منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی سے مجھ سے کم سے کم دس بارہ برس سے تعلقات ہیں میرے ذہن میں سولہ سال پیشتر کا وہ واقعہ آج بھی تازہ ہے جب مظفر نگر میں امن صاحب کی زیر صدارت ایک بہت کامیاب قومی مناظمہ منعقد ہوا تھا۔ اس محفل میں اُن کی پر کیف نظمیں سُن کر مجھے پہلی بار اُن سے عقیدت پیدا ہوئی اور اس کے بعد میں برابر کئی سال تک بیچ بیچ میں ان کی منظومات غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہا ـــــ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ عقیدت ترقی پذیر ہو کر دوستانہ تعلقات میں منتقل ہو گئی۔

اس دوران میں مجھے امن صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور شعوری حالات میں چھوٹی بڑی کئی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں اور میں نے تغیر حیات کے ہر رُخ اور نشیب و فراز میں انھیں دیکھا اور بہت غور سے دیکھا۔ اس لئے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُن سے متعلق میرے تاثرات

ایک محض سرسری علم رکھنے والے شخص کے تاثرات نہیں ہو سکتے۔ اس خودغرضی اور خودسری کے دور میں وہ عجیب غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ نہایت نیک اور خلیق ——— اور سچ پوچھیے تو زندگی اور سیاسیات سے متعلق بہت سی باتوں میں اصولی اختلافات کے باوجود، اُن کی یک رنگی، مستقل مزاجی، خطر پسندی، سادہ اور پر خلوص زندگی اور بے غرض قومی خدمت نے میرے ذہن پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

میں ادب کو چند فنی اصطلاحات اور روایات کی کسوٹی پر کس کر دیکھنے کا عادی نہیں ہوں، اور نہ ہی اُسے ادیب کی زندگی سے بے نیاز خیالات اور جذبات کا ایک گورکھ دھندا سمجھتا ہوں۔ وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے پیدا ہوتا ہے اور ہر صورت میں اپنے خالق کے شعور کا پرتو ہوتا ہے ——— اور یہ شعور بنتا ہے ادیب کے ذاتی اور سماجی ماحول کے مختلف دھاروں سے۔ اس لئے ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے ادیب کے ماحول کو سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے جو ادب کی تخلیق میں شریک غالب رہا ہے۔

امن کی زندگی کا بہترین حصہ "تیج" میں جائنٹ ایڈیٹری کی خدمت انجام دیتے گذرا۔ مگر یہ اخبار نویسی پیشہ سے زیادہ مشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُن کا قلم ہمیشہ ضمیر کی قوت سے چلا۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ وہ ۱۹۲۰ء سے مستقل طور پر آزادی کی جدوجہد میں شریک رہے۔ اس سلسلے میں کئی بار قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا، لاٹھیاں کھائیں، مگر کبھی پائے استقلال کو جنبش نہ ہو سکی۔ وہ ایک سچے گاندھی وادی ہیں، اور جہاں تک مجھے علم ہے اُن کا پورا گھرانا اپنے اصولوں پر پابندی سے قائم رہ کر مختلف صورتوں سے قومی خدمات

انجام دیتا رہا ہے۔

ہاں تو امن صاحب کی شخصیت اور اُن کے کلام کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اُن کے ماحول اور واقعاتِ زندگی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ وہ اودھ کے متوسط طبقے کے ایک سریواستو (کائستھ) خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ایک جدِ اعلیٰ اٹھارھویں صدی کے اواخر یعنی آصف الدولہ کے دورانِ عمل میں کسی شاہی خدمت پر مامور ہوئے اور اس وقت سے واجد علی شاہ کے نزول کے وقت تک شاہی ملازمتوں کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی منشی لچھمن پرشاد تھے، جو واجد علی شاہ کے عہد میں کپتان روشن الدولہ کے ماتحت مشعل خانۂ شاہی کے دیوان رہے۔ اُن کی وفاشعاری اور پابندیِ وضع کا کچھ اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

اودھ میں نیا نظام قائم ہونے پر حکومتِ برطانیہ نے انھیں سرکاری عہدہ پیش کیا۔ مگر اس پیش کش کو انھوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہندو عورت کا سہاگ اس کے شوہر کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیوہ ہونے پر وہ دوبارہ شادی نہیں کرتی" اُن کی زندگی کے آخری ایام بہت عسرت میں بسر ہوئے۔ یہ تو سب کچھ برداشت کیا مگر آخری دم تک کسی دوسرے کی نوکری نہیں کی۔ یہیں سے امن صاحب کے خاندان میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف نفرت کی روایات ملتی ہیں

اُن کے والد شری نہال دیو پرشاد بھی ایک خوددار شخص تھے اور اسی وجہ سے وہ کہیں نہ جم سکے۔ اُنھوں نے نو ملازمتیں کیں اور آخر میں لکھنؤ میونسپلٹی میں ہیڈ کلرک رہے۔ یہ اردو فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اردو فارسی میں ان

کا تخلص عاصی اور ہندی میں (اپنے نام کی رعایت سے) مہیش تھا عاصی ۱۸۹۹ء میں، جس سال امن پیدا ہوئے، کانگریس کے پہلے اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے ڈیلی گیٹ تھے۔

امن صاحب کی ولادت کے وقت اُن کے والد محترم لکھنؤ کے محلہ غوث نگر میں رہتے تھے، یہیں اُن کی ابتدائی تعلیم عمل میں آئی۔ انٹرنس اُنھوں نے امین آباد ہائی اسکول سے ۱۹۱۶ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں عزیز لکھنوی اسی اسکول میں اردو ٹیچر تھے۔ ان کی صحبت میں امن صاحب کے ذوق کو فروغ حاصل ہونا یقینی تھا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح بھی عزیز مرحوم ہی سے لی۔ انٹرنس پاس کرنے کا یہ سال ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ کا یادگار سال ہے کیونکہ اسی سال لکھنؤ میں کانگریس کا وہ تاریخی اجلاس ہوا تھا جس میں ایک طرف تو کانگریس اور لیگ اور دوسری طرف اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں نے حکومت وقت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا تھا۔ امن کا نفسیاتی تجزیہ کرنے والے کے لئے اِن واقعات کا علم بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اُن کے پورے شعور کی جڑیں اسی زمین میں پوشیدہ ہیں

انٹرنس پاس کرنے کے بعد امن صاحب نے بھی لکھنؤ میونسپلٹی میں ملازمت کر لی اور یہیں دورانِ ملازمت میں مختارشپ کا امتحان پاس کیا۔ یہ سنہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ اسی سال اُنھوں نے کانگریس کی تحریک میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا اور خود اُن کے بیان کے مطابق لکھنؤ کے ایک سیاسی جلسہ میں پہلی مرتبہ نظم پڑھی جو پنڈت آنند نرائن مُلا کے والد پنڈت جگت نرائن مُلا

کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں بالکل ابتدائی دور کو چھوڑ کر وہ پسرِ ونیسر بیج ناتھ فگار سے مشورہ سخن کرتے تھے جو آتش کے سلسلۂ تلامذہ میں تھے میونسپلٹی کی ملازمت اور ان کی سیاسی سرگرمیوں میں تصادم نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں لکھنؤ میونسپلٹی کانگریس کے زیرِ عمل آ چکی تھی۔

آخر اس پیشہ کو ترک کر کے اُنھوں نے ۱۹۲۷ء میں میرٹھ میں اور ایک سال بعد غازی آباد میں پریکٹس شروع کی۔ اس زمانے میں وہ اپنی زندگی پوری طرح قومی خدمات کے لئے وقف کر چکے تھے۔ جس کی وجہ سے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں سزائیں بھگتنا پڑیں۔

۱۹۳۲ء کی سزایابی کے بعد ۱۹۳۳ء میں انھوں نے دِلّی کے مشہور اخبار "تیج" میں ملازمت کر لی، اور یہ صحافت کا سلسلہ تقریباً پندرہ برس تک قائم رہا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں پھر ڈیڑھ برس تک نظر بند رہے، اور اب، ۲ فروری ۴۸ء سے دِلّی کی صوبائی حکومت کے ماتحت پریس افسری کے عہدہ پر مامور ہیں جس کے اب تک کئی نام بدل چکے ہیں۔

ان تمام واقعات کو ذہن میں رکھ کر اگر اس مجموعہ کا مطالعہ کیا جائے تو ہم امن کی شاعری کی حقیقی روح تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں جو منظومات شامل ہیں وہ سب محض پچھلے بیس برس کے نتیجۂ فکر کا ایک مختصر انتخاب ہیں امن صاحب نے پڑھنے والوں کی سہولت اور دلچسپی کے لئے اُنھیں کئی دوروں میں تقسیم کر دیا ہے جس کی تفصیل یوں سمجھنی چاہیے۔

(۱) سنہ ۳۱ء سے سنہ ۳۹ء تک

(۲) سنہ ۳۹ء سے سنہ ۴۲ء کی تحریک تک

(۳) سنہ ۴۲ء کی تحریک کے زمانے کا کلام

(۴) سنہ ۴۲ء کے آخر سے سنہ ۴۶ء کے وسط تک

(۵) وسط ۴۶ء سے ۱۵ اگست سنہ ۴۷ء تک

(۶) ۱۵ اگست سنہ ۴۷ء سے سنہ ۵۰ء تک

کتاب میں ادوارِ تصنیف کی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، اور یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ ہمیں حال میں جتنی دلچسپی ہوتی ہے اتنی ماضی میں نہیں ہوتی۔ حال کی قرارِ واقعی واقفیت کے بعد ہمارے دل میں ماضی کے علم کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور پھر یوں بھی فن رفتہ رفتہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ جہاں تک مشمولہ اصنافِ سخن کا تعلق ہے، ان میں غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مربع، مخمس، مسدس، مثنوی، گیت اور نظمِ آزاد سبھی کچھ ہے مگر اس صنفی تنوع کے باوصف شاعر کی وہی ایک اسپرٹ ہر مصرعہ میں محسوس کی جا سکتی ہے اور اس اسپرٹ کی صحیح ماہیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں خود شاعر کے کلام کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

امن صاحب کی شاعری میں داخلی اور خارجی عناصر کا ایک خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ وہ خارجی زندگی کے کرب و انتشار کو ایک مخلص اور عمل پسند شخص کی طرح محسوس کرتے ہیں اور اپنے فن کو وقت کی انقلابی روح سے ہم آہنگ کرنے کے آرزومند رہتے ہیں۔ اُن کی شاعری کے مرکزی جذبات، مساوات، آزادی، جوشِ عمل، امن اور غم زدہ قوم کے لئے راحت فزونی ہیں۔ زندگی اور عمل کے متعلق اُن کا

نقطۂ نظر ایک ایسے روحانیت اور اخلاق کی قدروں کے قائل مگر مخلص انسان دوست کا نقطۂ نظر ہے جو اپنی نیک نیت اور سعیِ پیہم کے بھروسے زندگی کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لینا چاہتا ہو۔ امن کی خاندانی روایات، لکھنؤ کی خلوص تہذیب آفریں فضا اور ذاتی میلانات نے اُنھیں اپنے وقت کی سب سے بڑی تحریک گاندھی واد سے منسلک کر دیا اور وہ آج تک اس کے فلسفہ سے روشنی حاصل کر کے عمل پیرا ہوتے ہیں، چند نظموں پر نظر ڈالنے سے ان خصوصیات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۹ء تک مجموعہ میں اس دور کی تقریباً ایک درجن نظمیں شامل ہیں جن میں اکثر کو ٹکنک کے لحاظ سے سیاسی یا قومی غزلیں کہنا چاہیئے۔ ہاں ایک "جنوں کی ضرورت" البتہ مخمس ہے اور پہلی نظم مثنوی۔

ان میں ایک نظم یکم اپریل ۱۹۳۵ء کے اس آئین سے متعلق ہے جس کے بارے میں جوش نے کہا تھا۔

نادان سمجھ رہے ہیں کہ حاصل ہوا فاق   دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

بہت کچھ غور و فکر کی نمائش اور گول میز کانفرنسوں کے بحث و مباحثے کے بعد جب یہ آئین منظور ہوا تو پورے ہندوستان میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، اس کے متعلق امن صاحب کہتے ہیں۔

وہ دے رہے ہیں بظاہر جو اختیار مجھے   غرض یہ ہے کہ کریں اور زیر بار مجھے
یہ اور بات ہے کھل کر نہ کہہ سکوں ورنہ   نہیں ہے آپ کے وعدوں پہ اعتبار مجھے

شروع کی دو نظمیں جذبات کے اس مدوجزر کی ترجمان ہیں جن سے

زندگی کے ناخوش گوار حالات میں ہر شخص کبھی نہ کبھی دوچار ہوتا ہے اس سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ شاعر ماحول سے مغلوب ہو کر قنوطیت پرست نہیں ہو جاتا، بلکہ رفتہ رفتہ اپنی قوت ارادی کو مجتمع کر کے دوبارہ خود کو پا لیتا ہے۔ طویل علالت اگر اُسے ایک وقت یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے

اولوالعزمیاں ہیں نہ وہ ولولے ہیں — ارادے بھی بے جان سے ہو چلے ہیں
نہ ہی دل ہے میرا نہ ہی جان میری — مگر خاک باقی نہیں آن میری
تسلی نہ بہبود کی آس ہے اب — سخن میں مرے پہلوئے یاس ہے اب

تو کچھ ہی زمانے کے بعد وہی یہ بھی کہتا ہے:

وہ زندہ کیا ہے جس کا بجھ گیا دل — سراسر نوحہ خوانِ زندگی ہے

اور پھر

جو مشرقی کا تحمل ہے یا قناعت ہے — خطا معاف ہو یہ موت کی علامت ہے

ان نظموں میں "جنون کی ضرورت" ایک دلچسپ چیز ہے۔ بہر حال عقل کے خلاف یہ ردِ عمل بورژوا تہذیب کے تضادات نے پیدا کیا تھا، اور اس دور کے تقریباً سارے مشہور شاعروں کے یہاں یہ کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے اقبال نے بھی کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا!

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مگر حقیقت یہ ہے کہ عقل اور عمل میں کوئی لازمی تضاد یا تناقص نہیں ہے، جن لوگوں نے عقل کی تکذیب کی ہے۔ اگر صحیح تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے بھی عقل ہی سے کام لیا ہے۔

اس دور کے کلام میں چار پانچ سیاسی غزلیں اور تین نظمیں، دو جنگ پر اور ایک کسان پر شامل ہیں۔ غزلوں کے کچھ شعر بہت دلچسپ اور پُر لطف ہیں اور پھر ان میں غزل کی وہ کیفیت بھی ہے جو اس صنفِ سخن میں رنگینی گھولتی ہے۔ مثلاً

فتنے برس رہے ہیں نگاہوں سے آپ کی — میں خوب جانتا ہوں جو یہ دیکھ بھال ہے
ابرو پہ چین جبیں پہ شکن بے سبب نہیں — معلوم ہے انھیں جو ہمارا سوال ہے

بندہ پروریاں تو مہیا ہیں ستم اوروں پہ بھی — ہے مگر مخصوص کچھ جور و جفا میرے لئے

کسان اور مزدور سے امن صاحب کی ہمدردی ان کی اس دور کی نظموں "امید مستقبل" اور "کسان" میں ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں جنگ سے متعلق ان کی نظموں پر ایک عبوری نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ گذشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں کہی ہوئی یہ نظمیں انسانوں کی عام محبت اور جنگ کے خوفناک انجام پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جنگ ہوس کا ایک عریاں رقص اور عبرتناک زہر خند ہے۔ اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور عہدِ حاضر میں سامراجی قوتیں جن اغراض سے نبرد آزما ہوتی ہیں۔ اُن سے کسی ایمان دار اور عقل مند شخص کو کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں امن صاحب کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

فضائے آسماں سے بے گنہ بندوں پہ بمباری — فنا کوشی کی خاطر نسلِ انسانی کی تیاری
بہانا خونِ انساں دورِ موجودہ کا اک فن ہے — تباہی ہاں تباہی مشرق و مغرب میں قدغن ہے

علم نے ترقی کی بے نیازِ دل ہو کر — رہ گئی ہر اک قوت رہنِ آب و گل ہو کر
فرد کا جو تھا جذبہ قوم میں اُبھر آیا — علم بربریت کو اور جوش میں لایا

دھن ہوئی سوار ایسی اپنی کامرانی کی | تل گئیں ہلاکت پر قوتیں جوانی کی
ظلم کے اداروں کے مٹنے کی ضرورت ہے | قدرِ آدمیت ہو یہ سکوں کی صورت ہے

امن کا رہنما انھیں ماحول کی اس خوفناک تاریکی میں تنہا شمعِ ہدایت نظر آتا ہے۔

ایک مردِ اعظم ہے عافیت کا شیدائی | یکدلی کا دیوانہ خیر کوش شیدائی

۱۹۴۲ء کی تحریک جتنا مختصر یہ دور ہے اتنی ہی اس کی نظمیں بھی تعداد میں کم ہیں مگر تنوع اس میں بہت ہے۔ ایک تو نظمِ آزاد "کاروان و منزل" ہے (جس کے عنوان پر مجموعے کا نام رکھا گیا ہے) ایک گیت ہے، ایک مربع ہے اور دو غزلیں۔ "کاروان و منزل" میں تحریک کے عروج و زوال پر ہمدردانہ مگر ناقدانہ نظر ڈالی گئی۔ نظم سے لطف لینے کے لئے اسے پورے کا پورا پڑھنا ضروری ہے "پنجرے کے پنچھی سے" بڑی عمدہ نظم ہے جس میں ہندوستان کو دوسری جنگِ عظیم میں شرکت سے منع کیا گیا ہے، اس کا ایک بند دیکھئے:

صیادوں کے جھگڑے سے تجھے کام نہیں ہے | کیا مرغِ گرفتار ترا نام نہیں ہے؟
گلشن میں لگے آگ تو کر فکر نہ زنہار | اے مرغِ گرفتار خبردار، خبردار!

"گیت" میں بے عمل "سبکسارانِ ساحل" اور حکومت کے متوسلوں کو ہلکے ہلکے ٹہوکے دیئے گئے ہیں جو گہرے نشتروں کا کام کرتے ہیں۔

ہم جان رہی ہیں تم کیا ہو تم ہم کو جو چاہو سمجھو | ہم کو اپنوں سے پریم سدا تم کو غیروں پر ہی غرور
ہم جانے کیا کیا جھیلیں گے ہم انگاروں سے کھیلیں گے | تم شیتل رہنے والے ہو ان لپٹوں سے بچنا ضرور

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک یہ نظر بندی کے زمانے کی تخلیقات ہیں اور شاید اپنے مخصوص ماحول کی وجہ سے ان میں تاثیر بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ زیادہ تو غزلیں ہی ہیں مگر کوئل سے متعلق دو نظمیں اور کچھ رباعیاں بھی ہیں۔

یوں تو آپس کے تنازعے ہر وقت برے ہیں، لیکن جدوجہد کے زمانے میں ان کے نتائج بہت ہی خراب ہوتے ہیں، ایک مخلص دل انھیں برداشت نہیں کرسکتا۔ دیکھئے امن صاحب کے دل کے تاروں کو چھو کر ان باہمی جھگڑوں نے کیسے پرسوز نغمے پیدا کئے ہیں:۔

اسیری میں بھی اپنی چشمکوں میں کچھ نہ فرق آیا
وہی جھگڑے قفس میں بھی ہیں جو تھے آشیانے میں

برہمن اور شیخ میں جھگڑے یہی ہیں رات دن
تیری کتاب کچھ نہیں تیری کتاب کچھ نہیں

اور پھر ان شعروں کی بصیرت پر بھی غور کیجئے:

بہت سے الفاظ ملتے جلتے ہمارے انکے کلام میں ہیں
مگر جو غیروں کا مدعا ہے ہمارا وہ مدعا نہیں ہے

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے یہ کہہ رہی ہیں نئی ہوائیں
کہ وہ بھی ہونے کو ہے جہاں میں جو کچھ بھی اب تک ہوا نہیں ہے

کہیں اسی میں نہ مضمر ہو زندگیِ چمن
جو برق کو تاکتی ہے میرے آشیاں کے لئے

افراد کی قربانیوں میں جماعتوں کی بقا کے راز کو کیسے خوب صورت شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

جو حقیقت دوسرے لوگوں کے یہاں یقین کی حد تک واضح ہے ایک خدا پر ایمان رکھنے والے شخص کے یہاں بھی ایک ہلکا سا شبہہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔

میرے خالق تیری مخلوق بھوکی مرتی جاتی ہے
کہے جاؤں تجھے پروردگارِ دو جہاں کب تک

یہاں ایک رباعی بھی نقل کی جاتی ہے جس میں اتحاد کا مضمون ایک نئے پیرائے میں جلوہ گر ہو کر جاذبیت پیدا کر لیتا ہے۔

اُمید وہ کیا جو ہو کے پوری نہ رہے ہندو مسلم میں کوئی دوری نہ رہے
یہ کیا کہ کوئی منائے کوئی نہ منائے ہولی ہو کہ عید ہو ادھوری نہ رہے

جون ۱۹۴۵ء سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک

۱۹۴۲ء کی تحریک کے خاتمہ پر حراست سے رہا ہونے پر جو نظمیں کہی گئی ہیں اُن میں اُمید و بیم کے پہلو بہت نمایاں ہیں۔ اُمید آزادی کی اور بیم حکومت کی ان وعدہ شکنیوں کی وجہ سے جس کا ہندوستان کی تحریک آزادی کو بہت کافی تجربہ تھا۔

انجام کار دیکھیں کیا شکل رونما ہو نقشے بدل رہے ہیں منظر بدل رہے ہیں
آئین کیسے بدلیں بدلا نہیں دل ان کا مضموں نہیں بدلتے مسطر بدل رہے ہیں

لیکن جب یاس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں تو وہ اپنے ایسے ہم وطن حریفوں پر پھبتیاں بھی کستے ہیں جن کے مفادات اور ہمدردیاں برطانوی تاج سے وابستہ ہیں۔

بوم و شپر کے لئے آمد سحر کی قہر ہے ہے یہ بےچینی اندھیرے کا سماں مٹ جائے گا
آہیں بھر بھر کر حریفوں کا یہ کہنا ہے کہ ہائے اب نظام کہنۂ ہندوستاں مٹ جائے گا

ان میں ایک نظم آزاد ہند فوج سے بھی متعلق ہے مگر مجھے سب سے زیادہ پسند وہ ہے جس کا عنوان ہے "گاندھی مجرم ہے" گاندھی جی پر اس مجموعہ میں آپ کو کئی نظمیں ملیں گی اور متعدد مقامات پر ان کی طرف اشارے ہیں مگر اس نظم کا طنزیہ انداز بیان بہت ہی پر لطف ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد

جدید ترین دور کا کلام اسلوب کے تنوع کے لحاظ سے سب سے اچھا

ہے، اور یوں بھی دوسرے ادوار کی نظموں سے ان کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اس دور کے اہم ترین واقعات، قوت کا انگریزوں کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونا فسادات اور گاندھی جی کی شہادت ہیں ان سب باتوں پر امن صاحب کے تاثرات ہیں مختلف مقامات پر ملتے ہیں، جہاں تک آزادی کا تعلق ہے اس پر نہ صرف یہ کہ وہ بہت خوش ہیں بلکہ اسے قوم کی آئندہ ترقیوں کے راستے کھولنے والا ایک عظیم الشان واقعہ تصور کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ امن صاحب ایسا شخص جس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسی کام کے لئے وقف کیا ہو، آزادی سے خوش کیوں نہ ہوتا؟ افلاس بے روزگاری، گرانی اور بھوک جو آزادی کے ساتھ آئے ان سے بھی وہ مایوس نہیں۔

چمن والو مبارک ہو تمھیں دورِ بہار آیا
خزاں کا کچھ اثر باقی ہے یہ بھی مٹ ہی جائے گا
دلوں میں شوق تو پرواز کا ہونے لگا پیدا
جو ضعفِ بال و پر باقی ہے یہ بھی مٹ جائے گا

اور اپنے ہم وطن سے یوں خطاب کرتے ہیں

احساس نہیں اب تک تجھکو آزاد ہے تو محکوم نہیں
آداب ہیں کیا آزادی کے شاید تجھکو معلوم نہیں
دریاؤں میں دولت بہتی ہے انمول خزانے دھرتی میں
تنظیم سے بس محروم ہے تو نعمت سے مگر محروم نہیں

امن جیسے شخص کے لئے جس کی پوری نظریاتی فضا پر اخلاق و محبت مسلط ہو فسادات کا جو اثر پڑنا چاہیئے تھا وہی پڑا کچھ زمانے کے لئے انسان کی فطری نیکیوں اور تہذیب کی ترقیوں پر سے ایمان ہٹنے لگا اور سارے ماحول میں یاس کے بھیانک سائے خونی رقص کرتے نظر آنے لگے

داد ملتی ہے ستم رانی و سفاکی کی یہ
زندگی ننگِ شرافت کبھی ایسی تو نہ تھی
جس کی تضحیک رہی میری زباں پر اکثر
نہی وحشت مرا مقسوم ہوئی جاتی ہے
بدلی جاتی ہیں زمانہ کی یہ قدریں کیسی
صفتِ رحم بھی مرحوم ہوئی جاتی ہے

مگر یہ کیفیت بہت دنوں تک باقی نہ رہی اور وہ ایک عزمِ جوان کے ساتھ ازسرِ نو میدانِ عمل میں آ گئے

جو ہندو مسلماں پر خار کھائے ۔ ترس بے گنہ پر نہ مسلم کو آئے
جو سکھ پریم کا راستہ بھول جائے ۔ جو عیسائی رسمِ وفا کو بھلائے

محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

اور وہ محسوس کرنے لگے کہ

گھبرائیں نہ ہمدردی و اخلاق کے حامی ۔ ہے دورِ عبوری ہی نہیں حالت یہ دوامی
آ جائیں گے پھر ذہن میں ایمان کے معنی ۔ انسان سمجھ جائے گا انسان کے معنی
مل جائیں گے اک روز جو دل آج پھٹے ہیں ۔ ہو جائیں گے ایک اب جو گروہوں میں بٹے ہیں
آئے گا ضرور آئے گا ساتھی وہ زمانہ ۔ جب پھر سے سنا جائے گا الفت کا ترانہ

امن صاحب کے لیے گاندھی کی شہادت کا واقعہ بھی فسادات سے کم جانکاہ نہ ہونا چاہیے تھا مگر یہ اُن کے کردار کا حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ اُنھوں نے اس زبردست قومی نقصان کو غیر معتدل غم و غصّہ کا محرک نہیں بننے دیا۔

ان سطروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض تعارف کے طور پر ہے ۔ اوپر کہیں کہیں اُن کی شاعری کے چند پہلو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اسے کوئی جامع تبصرہ یا آخری رائے نہیں سمجھنا چاہیے ۔ جو لوگ شاعری میں ایک مخلص اور حساس زندگی کے تمام کل پرزوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے کے شائق ہیں اُنھیں

سنہ ۱۹۴۷ء

گمنام شہید

آفریں ہے تجھے سو بار شہیدِ گمنام
عالمِ غیب سے منظور ہو شاعر کا سلام

نام کی تیرے نہیں اہلِ زمانہ کو خبر
قیمتِ آزادیِ کامل کی تری جاں تھی مگر

تجھ کو ڈائس پہ کسی نے نہیں دیکھا زنہار
نہ بیاں لینے کو آئے کبھی اہلِ اخبار

تجھ کو لکھنے کا سلیقہ کبھی آیا ہی نہیں
دخل تجھ کو فنِ تقریر میں کچھ تھا ہی نہیں

ترا چرچا نہ تو جلسوں میں نہ بازاروں میں
سُرخیاں نام کی تیرے نہ تھیں اخباروں میں

تو کہاں اور کہاں حوصلۂ نام و نمود
عزّت و قدر میں ہرگز نہ رہا تو محسود

تجھ کو کچھ اہلِ محلہ ہی فقط جانتے تھے
خوب ہنستے تھے وہ خبطی تجھے گردانتے تھے

اُن کی نظروں میں تو کچھ بھی نہ تھا دیوانہ تھا
کیوں کہ تو دنیوی اعزاز سے بیگانہ تھا

تیرے مرنے پہ کوئی ماتمی جلسہ نہ ہوا
جان دی ایسی خموشی سے تماشا نہ ہوا

اب جو آزادیِ کامل کی خبر پائی ہے
مدتوں بعد ہمیں یاد تری آئی ہے
قصرِ سوراج کا جو آج ہوا ہے تعمیر
اُس کی چوٹی پہ نمایاں نہیں تیری تصویر
ہڈیاں تیری مگر نیو میں اس کی ہیں نہاں
ذرّہ بنیاد میں جو ہو نظر آتا ہے کہاں
تو نے تاریخ بنا ڈالی ہے خاموشی سے
کون واقف ہے مگر تیری وفا کوشی سے

ہنگاموں کے آغاز پر

زندگی کیف سے محروم ہوئی جاتی ہے
قدر ہر جنس کی معدوم ہوئی جاتی ہے
دل تو کیا روح بھی مغموم ہوئی جاتی ہے
عقل ماحول کی محکوم ہوئی جاتی ہے
جس کی تضحیک رہی میری زباں پر اکثر
وہی وحشت مرا مقسوم ہوئی جاتی ہے

بدلی جاتی ہیں زمانے کی یہ قدریں کیسی
صفتِ رحم بھی مرحوم ہوئی جاتی ہے
سمتِ مغرب سے چلی ہیں یہ ہوائیں کیسی
کہ فضا ہند کی مسموم ہوئی جاتی ہے

قطعہ

ہونے لگی ہے کرگس و بوم و زغن کی قدر
صحنِ چمن میں اب نہیں اہلِ چمن کی قدر
اے اہلِ آبگینہ فروشی کے دور میں
دُرِ عدن کی قدر نہ لعلِ یمن کی قدر

ہنگاموں کا زور ہونے پر

سر دبازاریِ اُلفت کبھی ایسی تو نہ تھی
قدر افزائیِ وحشت کبھی ایسی تو نہ تھی
قصّۂ حضرت یوسف تو سُنا تھا لیکن
بھائی بھائی میں عداوت کبھی ایسی تو نہ تھی
دل میں آتا تھا غبار اور وہ دُھل جاتا تھا
مستقل گردِ کدورت کبھی ایسی تو نہ تھی

کبھی تکمیلِ محبت نہ ہوئی ہو چاہے
ہائے توہینِ محبت کبھی ایسی تو نہ تھی

داد ملتی ہے ستم رانی و سفاکی پر
زندگی ننگِ شرافت کبھی ایسی تو نہ تھی

یوں تو دیکھے ہیں کئی دورِ سیاست ہم نے
امن کے نام سے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنا عزم

ہر اک سمت عالم ہو طوفان کا سا نہ بیکس کو دیتا ہو کوئی دلاسا
نہ ہو خلق و الفت کا چرچا ذرا سا جب انسان ہو خونِ انساں کا پیاسا

محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

نہ ہو راگ کا جب خریدار کوئی نہ ہو تان سننے کو تیار کوئی
نہ رہ جائے نغموں کا معیار کوئی نہ باقی رہے ساز میں تار کوئی

محبت کے نغمے سُناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

جو ہندو مسلمان پر خار کھائے — ترس بے گنہ پر نہ مسلم کو آئے
جو سکھ پریم کا راستہ بھول جائے — جو عیسائی رسمِ وفا کو بھلائے

محبت کے نغمے سُناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

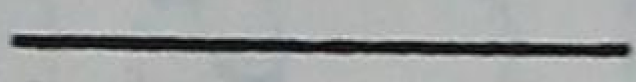
بدل جائیں سارے جہاں کی ہوائیں — مکدر نظر آئیں ساری فضائیں
عداوت کے انداز واعظ سکھائیں — برہمن اگر بیر کے گیت گائیں

محبت کے نغمے سُناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

کرے نامِ اُلفت سے نفرت زمانہ — جو بیگانہ ہو جائے ہر اک یگانہ
اُجڑ جائے اخلاق کا آشیانہ — نہ ہو بند میرے لبوں کا ترانہ

محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

جو دیوانے ہو جائیں ہر ملک والے
اشاروں پہ گوروں کے ناچیں جو کالے
اگر چل رہے ہوں چھرے اور بھالے
کسی کو مرا گیت شاید بچا لے
محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی



یاس و اُمید

کیا اب نہ سُنا جائے گا الفت کا ترانہ
کیا محو ہوا دل سے محبت کا فسانہ
کیا ہار گئیں قوتیں اخلاق کی ساری
کیا صاحبِ دل ہو گئے اب سعی سے عاری
کیا صلح کے ارباب کا جی چھوٹ گیا ہے
کیا امن کے رکھوالوں کا دل ٹوٹ گیا ہے

مفقود ہوئی دہر سے کیا رسمِ اخوت
انسان پہ غالب ہوئی شیطان کی قوت
گھبرائیں نہ ہمدردی و اخلاق کے حامی
ہے دورِ عبوری نہیں حالت یہ دوامی
آجائیں گے پھر ذہن میں ایمان کے معنی
انسان سمجھ جائے گا انسان کے معنی
مل جائیں گے اِک روز جو دِل آج پھٹے ہیں
ہو جائیں گے ایک اب جو گروہوں میں بٹے ہیں
آئے گا ضرور آئے گا ساتھی وہ زمانہ
جب پھر سے سنا جائے گا الفت کا ترانہ
ہر چند کوئی اہلِ وفا کو کرے مطعون
الفت جسے کہتے ہیں وہی زیست کا قانون

بدلیں گے یہ انداز بدل جائیں گے یہ طور
ہاں صبر و تحمل سے گذارو کوئی دن اور

اِس دور میں بھی نام محبت کا لئے جاؤ
مستقبلِ روشن کے لئے کام کئے جاؤ

سنہ ۱۹۴۷ء

مہاتما گاندھی کا مَرن برت

اس وطن کی ایک جانِ بے بہا خطرے میں ہے
آج خورشیدِ صداقت کی ضیا خطرے میں ہے
میں زباں سے کیا بتاؤں آج کیا خطرے میں ہے
اب شرافت ابتدا تا انتہا خطرے میں ہے
مجمعِ زاغ وزغن ہے آج صحنِ باغ میں
عندلیبِ نغمہ پرور کی صدا خطرے میں ہے

ہو رہا ہے پست معیارِ حیاتِ آدمی
آج کل اخلاق کی ساری فضا خطرے میں ہے
جان کا خطرہ تھا جب دِل کو غنیمت تھا وہ دور
آج کل تو دردِ دِل کی ہر دوا خطرے میں ہے
آج اِنسانوں کو اپنی بربریت پر ہے ناز
نسلِ اِنسانی کی نشو و ارتقا خطرے میں ہے

مہاتما گاندھی کی شہادت

شہید کون ہے اس شان کا وفا کے لئے
بتا سکے تو بتائے کوئی خدا کے

تھی زندگی بھی تری موت بھی خدا کے لئے
وہ اور ہوں گے جو مرتے ہیں ماسوا کے

یہ نکتہ کون سمجھتا ہے آج دنیا میں
بنا تھا درد کسی درد آشنا کے

اِسی لئے ہوں مسلمان میں کہ ہندو ہوں
تڑپتے ہیں حرم و دیر اِسی صدا کے لئے
یگانگی کے ترانے شہادتِ بے مثل
وہ ابتدا کے لئے اور یہ انتہا کے لئے
عدوئے رسمِ محبت نے کر دیا چھلنی
وہ ایک سینہ کہ جو وقف تھا وفا کے لئے
سمجھنے والے بالآخر سمجھ ہی جائیں گے
ابھی سے کیوں وہ سمجھتے نہیں خدا کے لئے
خدا ہی رحم کرے اُن مسافروں پر امّن
بھنور کو کھینچ کے لائے جو نا خدا کے لئے

شہادت کے بعد

اب سیرِ چمن میں کیا مزہ آتا ہے
گلگشت سے بھی دِل اپنا گھبراتا ہے
سُرخیٔ رُخِ گُل کی دیکھ کر گلشن میں
معصوم کا خونِ نظر میں بھر جاتا ہے

گنجینۂ معرفت تھا سینہ اُس کا
اُلفت کا پیام ہر قرینہ اُس کا
تھی اس کی شہادت میں کرامت کیسی
کیا ڈوب کے اُبھرا ہے سفینہ اُس کا

جب طبیعت سکوں پذیر ہوئی

ختم دورِ امتحاں ہونے کو ہے
ہند پھر جنت نشاں ہونے کو ہے
ظلم بے نام ونشاں ہونے کو ہے
امن کا سکہ رواں ہونے کو ہے
مژدہ باد اے نوجوانانِ وطن
مقتدر ہندوستاں ہونے کو ہے

احساس نہیں تجھ کو اب تک آزادی تو محکوم نہیں
آداب ہیں کیا آزادی کے شاید تجھ کو معلوم نہیں
دریاؤں میں دولت بہتی ہے انمول خزانے دھرتی میں
تنظیم سے بس محروم ہے تو نعمت سے مگر محروم نہیں

پستیِ نظر اوچھی باتیں آزادی کے یہ کام نہیں
ہو جوشِ عمل تیرا حصّہ تضحیک نہیں دشنام نہیں
تخریب کی باتیں چھوڑ کے اب تعمیر کی دھن میں لگنا ہے
ظاہر ہے کہ محنت سے بچ کر آزادی میں آرام نہیں

تسلی

چمن والو مبارک ہو تمھیں دورِ بہار آیا
خزاں کا کچھ اثر باقی ہے یہ بھی مٹ ہی جائے گا

سمجھنے تو لگے ہیں اہلِ ہند آدابِ آزادی
اگر کچھ شور و شر باقی ہے یہ بھی مٹ ہی جائے گا

دلوں میں شوق تو پرواز کا ہونے لگا پیدا
جو ضعفِ بال و پر باقی ہی یہ بھی مٹ ہی جائے گا

اُترتی جاتی ہے گردِ کدورت شیشۂ دل سے

جو داغ مختصر باقی ہے یہ بھی مٹ ہی جائے گا

دلوں سے مٹتا جاتا ہے اثر دورِ غُلامی کا

جو ربطِ سنگ و سر باقی ہے یہ بھی مٹ ہی جائے گا

جو وہمِ ناروا کا دور دورہ تھا ہوا رخصت

ابھی تک کچھ اگر باقی ہے یہ بھی مٹ ہی جائے گا

دلِ مایوس سے خطاب

یہ کارگاہِ فنا اور ثبات کیا معنی
سکوں پذیر ہو شکلِ حیات کیا معنی

تری حیات ہی موجوں سے کھیلنے کے لئے
کنارا ڈھونڈ رہا ہے یہ بات کیا معنی

تو پہلے جوہرِ قابل تو خود میں پیدا کر
نہ ہو جو پھر نگہِ التفات کیا معنی

ہر ایک تارے میں شمس و قمر کی روح تو پھونک
پلٹ نہ جائے اندھیری یہ رات کیا معنی
شرف ہی خلق پہ حاصل تجھے خدا شاہد
یہ خوفِ مخمصہ کائنات کیا معنی
تو صحنِ باغ میں دامن بچا کے چلتا ہی
نہ اُلجھنوں میں پڑے تیری ذات کیا معنی
یہ ادب اوب کے سانسیں بجھی بجھی نظریں
یہ حدِ جائزۂ ممکنات کیا معنی
وہ چال چل کے دکھائے امینِ مستقبل
ہو تیرا نقش قدم اور جبینِ مستقبل

ہے اضطراب سکوں کا حجاب یہ تو سمجھ
ہے یاس کفر کی کالی نقاب یہ تو سمجھ

بہت بلند ہے تیرا نصیب یہ تو جان
بہت وسیع ہے تیرا نصاب یہ تو سمجھ

جو چاہیں کہتے رہیں خارجی نظر والے
نہیں ہے ذات کا تیری جواب یہ تو سمجھ

خرد عذاب سہی، عقل اک عذاب سہی
لگا ہے کیوں تری جاں کو عذاب یہ تو سمجھ

تمام نوری و ناری تمام خاکی تھے
ہے تجھ پہ کیوں نظرِ انتخاب یہ تو سمجھ

وہ اک نظام کہ ہے راز جس کی ہر علت
کیا گیا تجھے کیوں انتساب یہ تو سمجھ

فسردگی کی فضاؤں سے تو نہ ہو مرعوب
تری نظر ہے پیامِ شباب یہ تو سمجھ
تجھے خبر ہی نہیں کس کا شاہکار ہے تو
خزاں کا خوف نہ کر جانِ صد بہار ہے تو

اشارہ

جسے مرنا بھی آتا ہے جسے جینا بھی آتا ہے
اجل بھی زِندگی ہے زندگی بھی زندگی اُس کی
کبھی ہنستا کبھی روتا یہ اک مجذوب کہتا تھا
بجھے گی شمع تب پھیلے گی ہر سو روشنی اُس کی

سنہ ۱۹۴۹ء

ایشور، اللہ تیرے نام

دِل رسم و روایت میں اٹک جاتا ہے
اِنسان سے انسان کھٹک جاتا ہے
ایشور، اللہ ایک ہی ذات کے نام
تفریق میں بے کار بھٹک جاتا ہے

"اے رسم و روایات کے دیرینہ غُلام"
کیوں مُفت میں ہوتا ہے اسیرِ اوہام
ہے نام وفا پہ مِٹنے والے کی صدا
ایشور، اللہ ایک ہی ذات کے نام

دورِ عبوری

ودّاعِ تیرگی ہے مژدہ شمس کے ظہور کا
ہے پھوٹنے کو سینۂ افق سے چشمہ نور کا
خروشِ زاغ پیشِ خیمہ نغمۂ طیور کا
نقیب ہے خمارِ یاس اُمید کے سرور کا

یہ دور ہے عبور کا، یہ دور ہے عبور کا

خموش تھا جو ساز اس میں کچھ صدا تو آگئی
مگر حقیقتاً ملے ہوئے نہیں ہیں سُر ابھی
یہ تار مِل ہی جائیں گے جو مطربوں نے فکر کی
کہ مختلف رہے نہ لحن حافظ اور شور کا

یہ دور ہے عبور کا، یہ دور ہے عبور کا

پھر اپنے گُل ہیں اپنے غنچے اپنا صحنِ باغ ہے
صُراحی و سبو ہیں اپنے اپنا ہی ایاغ ہے
ہے اپنا شحنہ اپنا محتسب دمِ فراغ ہے
مگر اب اپنی بزم میں سوال ہے شعور کا

یہ دور ہے عبور کا، یہ دور ہے عبور کا

یہ شور و شر ہے عارضی نہ کوئی بے قرار ہو
کوئی شکارِ یاس ہو نہ کوئی سوگوار ہو

نظر میں جس کی وسعتیں ہوں کیوں وہ اشکبار ہو
نشان دے رہا ہے اور کچھ نظارہ دور کا

یہ دور ہے عبور کا، یہ دور ہے عبور کا

سُن اے وطن کے مسلمِ اسیرِ یاس خستہ دِل
کبھی رہا تو مشتعل کبھی ہوا تو منفعل
قدم بڑھا کے بانیانِ نظمِ نو کی صف میں مِل
نہ چھوڑ دامنِ اُمید حُکم ہے حضور کا

یہ دور ہے عبور کا، یہ دور ہے عبور کا

ساقی سے خطاب

سب پہ یکساں بھی جو ہو تیری نظر اے ساقی
ہوگا رندوں پہ جداگانہ اثر اے ساقی

میکدے پر کہیں یورش نہ ہو میخواروں کی
بخل سے کام نہ لے دیر نہ کر اے ساقی

میکدے میں ترے اعجاز پہ حرف آتا ہے
ابھی رندوں کو ہے کچھ اپنی خبر اے ساقی

جام و پیمانہ صراحی و سُبو ایک طرف
اک طرف ہے تری دزدیدہ نظر اے ساقی

ہوش سے سب کو رہا کر ترے میخانے کی خیر
ہر بشر آج ہے آمادۂ شر اے ساقی

اہلِ میخانہ ہیں جتنے ترا مُنہ تکتے ہیں
تو سمجھتا ہے اُنھیں دست نگر اے ساقی

جس سے ایماں نہ رہے دل نہ رہے جاں نہ رہے
وہ نظر ہاں وہ نظر ہاں وہ نظر اے ساقی

بیٹھے ہیں میکدے میں جام ملے یا نہ ملے
دیر و کعبہ میں نہیں اپنا گذر اے ساقی

کیا بتاؤں کہ یہ مستی ہے کہ ہے شرطِ ادب
جھک گیا ہے درِ میخانہ پہ سر اے ساقی

نہ رُکے جام کی گردش ابھی میخانے میں
کہ ہیں گردش میں ابھی شمس و قمر اے ساقی
ایک رِستا ہوا ساغر ہی مجھے مل جائے
ورنہ بہہ جائے گا یہ دیدۂ تر اے ساقی

کچھ باتیں

لوگ جب جبر و وحشت کی باتیں کریں
سر بہ کف ہم محبت کی باتیں کریں

ہم نے مانا کہ یہ دورِ وحشت کا ہے
پھر بھی مہر و محبت کی باتیں کریں

بوالہوس قدر سے جس کی واقف نہ ہوں
ایسی سربستہ دولت کی باتیں کریں

خود فریبی میں بھی قدرے تسکین ہے
ہنس کے دورِ مصیبت کی باتیں کریں

تلخیوں سے جو معمور ہے زندگی
آؤ آؤ حلاوت کی باتیں کریں

تیرگی تیرگی الحفیظ الاماں
رات کو ردِّ ظلمت کی باتیں کریں

باتوں باتوں میں دنیا بدل جائے گی
اس بدلنے کی صورت کی باتیں کریں

جس کی نظروں میں تھا ہیچ تاجِ شہی
اُس قلندر کی سطوت کی باتیں کریں

جو کسی کو بھی دشمن سمجھتا نہ تھا
اُس مجسم شرافت کی باتیں کریں

جان جس نے طریقِ محبت میں دی
اُس مسافر کی عظمت کی باتیں کریں

مرتے مرتے جو طوفاں سے کھیلا کیا
اس شناور کی ہمت کی باتیں کریں

ننگِ اجداد و اسلاف ثابت ہوئے
امنؔ اب کیا مشیخت کی باتیں کریں

مُسلسل فریب

ہے منزل ایک دھوکا اور سفر بھی ایک دھوکا ہے
مناظر بھی ہیں دھوکے اور نظر بھی ایک دھوکا ہے
نہ جانے ربط ہے جذبات و احساسات میں کیسا
محبت اور محبت کا اثر بھی ایک دھوکا ہے

یہ جو انسان کی فطرت مائلِ عقدہ کشائی ہے
یہ جتنی کشمکش ہے جس قدر زور آزمائی ہے
ازل سے تا ابد جاری ہے عنوانات ہوں کچھ بھی
فریبِ ارتقا ہم رنگِ شوقِ خود نمائی ہے

یہ جو نغمے کی کیفیت مجھے مسرور کرتی ہے
یہ جو اشعار کی خوبی مجھے مسحور کرتی ہے
مرے ہمسائے پر ان کا اثر ہوتا نہیں کچھ بھی
ہے میری خود فریبی جو مجھے مجبور کرتی ہے

طبائع مختلف ٹھیریں تو پھر معیار کیا ٹھیرا
نگاہیں اپنی اپنی جلوۂ دیدار کیا ٹھیرا

حوادث سے اگر افراد کی تعمیر ہوتی ہے
تو کیا ہے انفرادیت تو پھر پندار کیا ٹھیرا

کوئی کہتا ہے پیہم کش مکش یہ زندگانی ہے
کوئی کہتا ہے باقی ہے کوئی کہتا ہے فانی ہے
مسلسل ایک چکر ہے کسی کا ہے یہ اندازہ
کوئی کہتا ہے بعد اس کے حیاتِ جاودانی ہے

خزاں کو کچھ نہ سمجھو فصلِ گل کی آرزو سمجھو
بہاروں میں گلستاں کو فریبِ رنگ و بو سمجھو
ہیں جتنے مسئلے سب خود فریبی کے مناظر ہیں
نظر میں ہو جو گہرائی فریبِ جستجو سمجھو

اگر یہ خود فریبی ہے فریبِ عیش ہی کھائیں
اگر دھوکے ہیں خار و گل تو دل پھولوں سے بہلائیں
حقیقت آشنا ہونا تو ہے کس کے مقدر میں
فریبِ رنگ و بو کے دور میں گلشن میں مرجائیں

رقابت

بگولوں کو اچھلتے آبشاروں سے رقابت ہے
خزاں کے دور کو اب نوبہاروں سے رقابت ہے
جو دردی کش رہے ہیں وہ بھی بیگانوں کی محفل میں
انھیں عہدِ ازل کے میگساروں سے رقابت ہے
جو کڑیاں جوڑتے رہتے تھے زنجیرِ غلامی کی
اُنھیں شانِ وطن کے پاسداروں سے رقابت ہے

بنا ہے جن کی تحریکوں کی مکر و زور و وحشت پر

انھیں الفت پرستوں حق شعاروں سے رقابت ہے

ہوا و حرص کے مارے ہوئے کچھ خام کاروں کو

جنونِ عاشقی کے پختہ کاروں سے رقابت ہے

فرومایہ حقیر و ہیچ بے رونق شراروں کو

عطارد، مشتری جیسے ستاروں سے رقابت ہے

سوارانِ خرانِ لنگ کا یہ حوصلہ دیکھو

جو چابک دست ہیں ان شہسواروں سے رقابت ہے

تعفن خیز سوہانِ نظر نالے جو بہتے ہیں

انھیں گنگ و جمن کے تیز دھاروں سے رقابت ہے

آزادی کی سال گرہ

مکمل ہوا بن کے جب آشیانہ
ہمیں بانیِ آشیاں یاد آی

بہاروں میں بھی رہ گئی ٹیس دل میں
کھِلا جب چمن باغباں یاد آی

ہوا جشنِ آزادئ ہند جس جا
تو اے مرنے والے وہاں یاد آی

جہاں بادشاہوں کے سر جھک گئے تھے
مجاہد کا وہ آستاں یاد آیا
یہ منزل، ہوئی ذات سے جن کی حاصل
شہیدوں کا وہ کارواں یاد آیا
وہ دشمن کو بھی جس نے دشمن نہ سمجھا
محبت کا اک رازداں یاد آیا

گاندھی کو سلام

وہ پریم رس کا جام تھا — کہ موہن اُس کا نام تھا
بذاتِ خود پیام تھا — اُسے مرا سلام ہے

وہ صاحبِ کمال تھا — کہ حال رشکِ قال تھا
بلند ہر خیال تھا — اُسے مرا سلام ہے

تصورات کا دھنی تخیّلات میں غنی
بہ ایں ہمہ فروتنی اُسے مرا سلام ہے

برہنہ تن فقیر تھا وہ قوم کا امیر تھا
جو اپنی خود نظیر تھا اُسے مرا سلام ہے

یگانگی کا ساز تھا وطن کو جس پہ ناز تھا
وہ اک جہانِ راز تھا اُسے مرا سلام ہے

بلند آستانہ تھا وہ ہستئ یگانہ تھا
وہ رونقِ زمانہ تھا اُسے مرا سلام ہے

اگرچہ دل میں جوش تھا مگر بہ قیدِ ہوش تھا
وہ ہوش جوش پوش تھا اُسے مرا سلام ہے

مرقعِ ثواب تھا وہ مردِ لاجواب تھا
زمیں پر آفتاب تھا اُسے مرا سلام ہے

وہ مردِ حق پرست تھا وہ رازدانِ ہست تھا
وہ سرخوشِ الست تھا اُسے مرا سلام ہے

حرم ہو یا صنم کدہ ہر اک میں جلوہ یار ک
یہ کہتے کہتے چل دیا اُسے مرا سلام ہے

وہ رہنمائے بے بدل　　　　کہ لاغری میں تھا سبل
فنا نہ کرسکی اجل　　　　اُسے مرا سلام ہے

انسانیت

یہ کہتے ہیں کہ سب مخلوق سے انسان افضل ہے
نہ ہو جب جوہرِ ذاتی تو پھر دعویٰ یہ مہمل ہے
جو ظلم انسان کرتا ہے وہ حیواں کر نہیں سکتا
وہ کون ایسی جفا ہے جو کہ انساں کر نہیں سکتا
تمدّن کی ترقی میں ادائے جور شامل ہے
فروغِ ارتقا میں ہمنشیں کچھ اور شامل ہے

جسے ہم علم سمجھے ارتقائے بربریت ہے
کہ ایٹم بم بنانا آج شانِ آدمیت ہے
یہ رفتارِ ترقی کیا ہے اس کی کون منزل ہے
ہے کیا مستقبلِ انساں سمجھنا سخت مشکل ہے
گھروندے ہیں حدودِ رنگ و نسل و قوم و مذہب کے
ہوئے دل تنگ اور آدرش نیچے ہو گئے سب کے
بتوں کے نام پر لڑنا، خدا کے نام پر لڑنا
غرض ہر کام پر، ہر نام پر، ہر گام پر لڑنا
گرے انسان تو حیوان کی حد سے بھی گر جائے
بنے شیطانِ ثانی آدمیت سے جو پھر جائے

محبت کا سبق دینے کو اک انسان آیا تھا
وہ سودائے محبت سر میں دل میں درد لایا تھا

تمدن کی ترقی کا حقیقی راز سمجھا تھا
فروغِ آدمیت کا ہر ایک انداز سمجھا تھا

بلند اس کی نگاہیں تھیں مصفا آئینہ دل تھا
وہی انساں تھا جو انسان کہلانے کے قابل تھا

وہ تھا اخلاق کا پُتلا رواداری مجسّم تھا
وہ اس کا قلبِ صافی تھا کہ ظرفِ دردِ عالم تھا

نگاہِ تنگ میں اس کی عطا کوشی بُری ٹھیری
جفا کاروں کی نظروں میں وفا کوشی بُری ٹھیری

ہوئیں کف دردہاں جو قوتیں تھیں بربریت کی
بُجھا دی اس کی شمع زندگانی کیا قیامت کی

زمانہ کش مکش کا ہے چھڑی ہے جورِ والفت میں
عبوری دور ہے یہ ارتقائے آدمیت میں

ردِّ یاس

ذرا اُجالا ہوا ہے مدھم کہو نہ یہ روشنی نہیں ہے
نہ اہلِ محفل ہوں رہینِ حسرت کہ شمعِ اُلفت بجھی نہیں ہے

یہ میں نے مانا کہ ارتقائے حیات اب تک ہے نامکمل
مگر یہ کہنا غلط سراسر کہ آدمی آدمی نہیں ہے

اُمید پر زندگی ہے قائم کہ یاس ہے موت کی علامت
نکل کے میداں میں گنگناؤ اگرچہ دل میں خوشی نہیں ہے

یہ زرد پتے تو دیکھے تم نے وہ پھوٹتی کونپلیں بھی دیکھو
بہار آنے کو ہو رہی ہے اگرچہ آئی ابھی نہیں ہے
عبور کا دور ہے یہ ہمدم اسے نہ سمجھو کہ مستقل ہے
رہے وہ مجبور تا بہ آخر یہ قسمت آدمی نہیں ہے

سنہ ۱۹۵۰ء

سالِ نو کا پیغام

نیا ساز اور نئے نغمے نیا مطرب نئی محفل
چراغِ بزمِ حریّت کی لَو دیتا ہوا آیا
مبارک ہو تمھیں یہ دورِ نو ہندوستاں والو
نیا سال اک پیامِ نظمِ نو دیتا ہوا آیا

قصیدہ

جشنِ جمہوریت ہند

ہوا کے فیض سے ہر سبز پوش ہے مخمور
نئی اداؤں سے ہیں آج نغمہ سنج طیور

ہیں آج قلب و نظر انبساط سے معمور
ہمارے ملک میں قائم ہوا نیا دستور

وہ رہنمائی میں جس کی بنا نیا دستور
ہے آج رونقِ محفل بہ شکلِ صدرِ صدور

نہ احتیاج رہی مستعارِ مستی کی

بغیرِ منتِ صہبا ہم آج ہیں مسرور

رہے نہ سکر و بیوست کہ تازگی کا ہے دور

کہیں نہ اب متعفن ہوں خوشۂ انگور

یہ دورِ نو ہے پیامِ ایشیائے نو کے لئے

گیا وہ دورِ شہی دورِ قیصر و فغفور

نہ فرقہ بند نہ دہشت پسند پنپیں گے

مسلط آج ہوئی حکمرانیِ جمہور

میں اُن کو کیا کہوں جو دورِ نو کے دشمن ہیں

دہند بانگ سگاں ماہ می فشاند نور

نظر جو آتے ہیں آشفتگی کے کچھ آثار

ہے اس کی وجہ بظاہر کہ ہے یہ دورِ عبور

جو خامیاں ہیں وہ سب دور ہو ہی جائیں گی
کہ حکمرانی میں آتا ہے تجربہ سے شعور

درست نیتِ رہبر ہے یہ بھی کیا کم ہے
وہ راہبر جو ہے سارے جہان میں مشہور

کروں جو مدح تملق پہ ہو گی وہ محمول
اسی سے مدح سرائی نہیں مجھے منظور

نئے نظام میں کوئی نہ ہو کسی کا غلام
کرے نہ جبر کوئی اور نہ ہو کوئی مجبور

یہ مدعا ہے کہ آسودہ حال ہو دہقاں
یہ حوصلہ ہے کہ آرام سے رہے مزدور

ملے بہ قدرِ ضرورت ہر ایک کو ساماں
ہر ایک فرد کرے کام تا حدِ مقدور

عوام ضابطہ و قاعدہ کے ہوں پابند
ہوں خوش سلیقہ جو ہوں انتظام پر مامور
نہ گوشِ شیخ پہ ناقوس کی صدائیں ہوں بار
اذاں سے ہو نہ برہمن کو ادعائے نفور
رہے سروں میں نہ سودائے کبر ملت و نسل
نہ ذات پات کے جھگڑے وطن سے ہوں کافور
سماج ایسی ہو قائم نہ جس میں ہوں طبقات
نہ اجتماعِ زر و مال ہو بنائے غرور
ہر ایک ہو متبسم بسانِ غنچۂ نو
ہر ایک دل میں محبت کا نور غیرتِ طور
ابھی یہ مانے نہ مانے کوئی یہ بات ہی اور
بنے گا راہنمائے جہاں یہ ملک ضرور

نئے آئین کے بعد

یہاں کوئی نہیں ہے غیر سب اپنے ہی اپنے ہیں
کہ اپنی انجمن ہے اور میرِ انجمن اپنا

مبارک ہو مبارک ہو یہی ہر سمت چرچا ہے
اُٹھا غیروں کا سایہ آج ہے اپنا وطن اپنا

وہ ہے خود غیر جو اب درسِ غیریت کا دیتا ہے
نہ ایسا شیخ اپنا ہے نہ ایسا برہمن اپنا

تعلی کیا حقیقت ہے بہت جلد آئے گا وہ دن
کہ ہوگا غازۂ روئے تمدّن علم و فن اپنا
جو رہبر بھی ہمارا حکمراں بھی ہے یہ کہتا ہے
مشن تھا جو شہیدِ قوم کا وہ ہے مشن اپنا
زباں پر اب نہ لاؤ دورِ محکومی کی باتوں کو
بدل دو امن تم بھی آج سے رنگِ سخن اپنا!

نئے آئین کے نفاذ پر
گاندھی کی یاد

بہارِ تازہ چمن میں آئی کھلے ہیں گل باغباں نہیں ہے
سجی ہوئی ہے طرب کی محفل سجانے والا یہاں نہیں ہے
ہزار دقّت سے قافلہ یہ پہنچ گیا تا بہ حدِ منزل
مگر دکھائی تھی راہ جس نے وہ رہبرِ کارواں نہیں ہے
ہے اک معمّا مگر حقیقت کہ سورج اپنی ضیا میں ڈوبا
یہ نور پھیلا ہوا ہے جس کا وہ مہرِ انور عیاں نہیں ہے

یہ جشنِ جمہور ہو مبارک نیا یہ دستور ہو مبارک
سلام ہو تجھ کو روحِ گاندھی غلام ہندوستاں نہیں

پیامِ اُمید

طبیعتیں ہیں وہی پُرانی مگر چمن کی فضا نئی ہے
ابھی سے کیا شکوۂ بہاراں ابھی ابھی تو خزاں گئی ہے
جدید خاکے اُبھر رہے ہیں قدیم نقشے بگڑ رہے ہیں
نئے شگوفے بھی کھل رہے ہیں پُرانے پتّے بھی جھڑ رہے ہیں

چھپائے ہیں بدلیاں ابھی تک اگرچہ سورج نکل چکا ہے
یقیں تمھیں آئے یا نہ آئے مگر زمانہ بدل چکا ہے

عمل کا میداں بہت بڑا ہے دلوں میں جوشِ عمل نہیں ہے
مشیرِ تعمیر ہیں بہت کم جسے بھی دیکھو وہ نکتہ چیں ہے

عبورکا دور ہے ابھی تک یہ نا اُمیدی یہ یاس کیوں ہے
طرب کا ساماں ہورہا ہے یہ ساری محفل اُداس کیوں ہے

نہیں ہے صیاد اب چمن میں یہ دور دورہ ہے باغباں کا
چلے ہی جائیں گے بوم و کرگس نہیں رہا ہے عمل خزاں کا

کریں گے گلشن کی آبیاری شہیدِ الفت کے خوں کے قطرے
کرو تحمل برائے چندے مٹیں گے جورِ خزاں کے خطرے

بہار پھر بھی بہار ہی ہے

گلوں کی کثرت ہو یا کمی ہو بہار پھر بھی بہار ہی ہے
کلی ہو چپ یا چٹک رہی ہو بہار پھر بھی بہار ہی ہے
تمھیں شعورِ نظر نہیں ہے بہار کو ہیچ کہنے والو
گھٹا گھری ہو کہ چاندنی ہو بہار پھر بھی بہار ہی ہے
طیور کی نغمہ سنجیاں ہیں کہیں ہے کوکو کہیں ہے پی پی
اگر خروشِ زغن کبھی ہو بہار پھر بھی بہار ہی ہے
ہوا میں تندی بھی ہو اگر کچھ اُسے نمو کا پیام سمجھو
جو چند پتوں میں برہمی ہو بہار پھر بھی بہار ہی ہے

اِرتقائے حیات؟

ارتقائے حیات ہونے سے　　آدمی کو خلیق ہونا تھا
ماہیِ آب یا چرند و پرند　　اس کو سب کا رفیق ہونا تھا

ہو گئی عقل کی تو نشو و نما　　قوتِ دل نہ ہو سکی بیدار
یعنی ہر مادی ترقی سے　　آدمی اور ہو گیا خوں خوار

اور ہر نوع کا تو ذکر ہی کیا — آدمی آدمی کا دشمن ہے
سود خواری کہیں کہیں وحشت — تیرگیِ زمانہ روشن ہے

ہے کسی کو غرور طاقت پر — کوئی دولت کو زندگی سمجھا
آدمی آدمی وہی ہے مگر — جو محبت کو زندگی سمجھا

سنہ ۵۰ء میں

گاندھی جینتی

سُننے والے پے بہ پے چیں بر جبیں ہوتے رہے
اور وہ افسانۂ اُلفت سُناتا ہی رہا
ساز ٹوٹے اہلِ محفل شور و شر کرنے لگے
وہ مغنی اپنی دُھن میں گنگناتا ہی رہا

بادِ صرصر چل رہی تھی باغ میں تھا اضطراب
اور وہ بکھرے ہوئے تنکوں کو چُنتا ہی رہا
ایسی شورش تھی کسی کی کوئی سُنتا ہی نہ تھا
اور وہ آوازِ ضمیرِ پاک سُنتا ہی رہا

آندھیاں سی آندھیاں تھیں الحفیظ والاماں
اُس نے ہاتھوں سے بچائی شمعِ آزادی کی لو
بعدِ چندے کارنامے اس کے سمجھے جائیں گے
ہائے وہ پیر جواں دل وہ امینِ دورِ نو

اُس نے ایسے وقت اُٹھائی مہر و الفت کی صدا
بربریت دھرم تھی جب فتنہ جب ایمان تھا
نسلِ آئندہ یہ پوچھے گی بڑی حیرت کے ساتھ
دور میں وحشت کے ایسا بھی کوئی انسان تھا

آزادی کے چراغ

چراغ جل تو گئے ہیں یہ بُجھ نہ جائیں کہیں

ہوائیں تند ہیں ہر لو میں تھرتھراہٹ ہے

یہ لو تو کیا ہی لرزتا ہی میرا دل اے دوست

کہ لرزہ خیز فضاؤں کی سنسناہٹ ہے

چراغ جل تو گئے ہیں نظر نہ لگ جائے

نظر بھی اُن کی کہ جن کے یہاں اندھیرا ہے

نگاہِ بد سے بچانا ہے اِن چراغوں کو

ابھی ہے پچھلا پہر دور ابھی سویرا ہے

چراغ جل تو گئے ہیں مگر شریر اَطفال

اُلٹ نہ دیں کہیں جلتے ہوئے چراغوں کو

سلامتی جو ہے منظور اِن چراغوں کی

کرو درست اِن اطفال کے دماغوں کو

چراغ جل تو گئے ہاں چراغ جل تو گئے

مزہ تو جب ہے اندھیرا نہ ہو چراغ تلے

چراغ بام پہ ہوں فرش و آستاں پہ چراغ

بلند و پست میں سب کہہ اٹھیں چراغ جلے

رواداری

اِس بستی کی رونق ہی تبھی جب میں بھی رہوں اور تو بھی رہے
مسجد بھی رہیں مندر بھی رہیں مُسلم بھی رہے ہندو بھی رہے
ہندو کی زباں اُردو بھی ہے، مسلم کی زباں ہے ہندی بھی
آزاد وطن کی شان ہے یہ ہندی بھی رہے اردو بھی رہے

آزادی سے کچھ پہلے

(جولائی سنہ ۴۴ء سے اگست سنہ ۴۷ء تک)

گاندھی مجرم ہے

قصور وار نہ ٹھیرائیں کیسے گاندھی کو
وہ آج خلق و مروت کا نام لیتا ہے
درندگی کے زمانے کی عظمتوں کی قسم
جنوں زدہ ہے شرافت کا نام لیتا ہے
نہیں جو دار تو زنداں میں رکھئے اس کو ضرور
وہ ہندیوں کی حکومت کا نام لیتا ہے

بڑا قصور ہے اس کا بڑی خطا اُس کی
وہ ارتباط و محبت کا نام لیتا ہے

جو مُدعیِ خرد ہیں وہ اُس پہ ہنستے ہیں
وہ آج روح کی طاقت کا نام لیتا ہے

غلط مُطالعہ اس کا ہے تجربہ ناقص
سیاسیات میں اُلفت کا نام لیتا ہے

سکوں نصیب ہو کیا امن کو زمانے میں
وہ ایک دشمنِ راحت کا نام لیتا ہے

ہیں آج اہلِ حکومت خلاف گاندھی کے
بھلا اسی میں ہے اُس کو سدا بُرا کہیے

ہے اتنی بات میں بھی جان و مال کا خطرہ
نہ آفریں اُسے کہیئے نہ مرحبا کہیئے
ہر ایک بات میں اس کی نکالیئے سو عیب
سزا نہ دیجیئے اُس کو تو ناسزا کہیئے
وہ معترف ہی کہ مجھ کو تلاشِ منزل ہے
نہ راہبر اُسے کہیئے نہ رہنما کہیئے
کرے گا کون اُسے آج عاقلوں میں شمار
جو کہہ رہا ہو یہ سب سے خدا خدا کہیئے
کسی بھی قاعدہ قانون کی گرفت نہیں
لتاڑیئے اُسے الفاظ ناروا کہیئے
زبانِ امن پہ گاندھی کی نکتہ چینی ہی
سوائے مصلحتِ وقت اس کو کیا کہیئے

اپنی اپنی سمجھ

جو عاقل ہیں وہ کہتے ہیں دنیا میں سنبھل کر چلنا ہے
کچھ دیوانوں کا کہنا ہے، ہر گام اچھل کر چلنا ہے

بستی میں سب فرزانے ہیں ویرانوں میں دیوانے ہیں
دیوانوں سے ملنے کے لئے بستی سے نکل کر چلنا ہے

آسان تھی لیکن تھی وہ غلط جس راہ پہ اب تک چلتے تھے
کانٹوں سے گذرنا ہی ہم کو، اب راہ بدل کر چلنا ہے

کانٹوں سے جھجکنا کیسا ہے، کانٹوں سے اُلجھنا کیا معنی
تلووں کو ذرا مضبوط کریں کانٹوں کو کچل کر چلنا ہے
آہستہ روی اب ٹھیک نہیں رہرو اپنی رفتار بدل
کُہسار کے چشموں کی صورت ٹکرا کے اُبل کر چلنا ہے

طلباء کو سعادت مندی کا سبق

محرومِ ثواب ہوتے جاتے ہو تم
غیروں کو عذاب ہوتے جاتے ہو تم
لاتے ہو زبان پہ ذکر آزادی کا
پڑھ لکھ کے خراب ہوتے جاتے ہو تم

یہ کیا کہ وطن کے گیت گاتے ہو تم
کیوں نیند کے ماتوں کو جگاتے ہو تم
کہتے ہو کہ ملک کو کریں گے آزاد
کالج میں شریر ہوتے جاتے ہو تم

جھک کر چلو آئینِ سعادت ہے یہی
آنکھیں نہ اُٹھاؤ نیک عادت ہے یہی
لاؤ نہ زباں پہ ذکر آزادی کا
انگریز کا خوف ہو شرافت ہے یہی

آزادی کے نام پر اُچھلتے ہو تم
ہندی ہو کر اکڑ کے چلتے ہو تم

کچھ اپنی حقیقت کا بھی رکھو احساس
انگریز کے کالجوں میں پلتے ہو تم

آزادی کی آواز لگائی تُم نے
پائی ہے کہاں سے یہ ڈھٹائی تم نے
لازم ہے کہ رکھو اسے اعزاز کے ساتھ
میراث غُلامی کی جو پائی تُم نے

گاندھی جی کی سالگرہ

گاندھی کا جنم دِن ہے یہ ہندی حساب سے

عمرِت دراز باد یہ ہر ایک لب پہ ہے

کیونکر جگہ نہ اُس کے لئے سب کے دل میں ہو

اُس کی نگاہِ لُطف و عنایات سب پہ ہے

غزل

مانا کہ ظالموں کے تیور بدل رہے ہیں
مظلوم بھی نگاہیں اکثر بدل رہے ہیں

بہہ جائے خونِ مشرق لیکن خبر نہ ہو کچھ
فصادِ مغربی کے نشتر بدل رہے ہیں

انجامِ کار دیکھیں کیا شکل رو نما ہو
نقشے بدل رہے ہیں منظر بدل رہے ہیں

آئین کیسے بدلیں بدلا نہیں دِل اُن کا
مضموں نہیں بدلتے مسطر بدل رہے ہیں
اِن اہلِ کارواں کی عقلوں کو کیا ہوا ہے
جب ہے قریب منزل رہبر بدل رہے ہیں
دنیا بدل رہی ہے اب ہم بھی کیوں نہ بدلیں
ہاں ہم بدل رہے ہیں کہہ کر بدل رہے ہیں

آزاد ہند فوج کا مقدمہ

وطن سے اپنے محبت کوئی قصور نہیں
وطن کے حق میں بغاوت کوئی قصور نہیں

روا ہے سب کے لئے جد و جہد آزادی
ہے یہ تو عین سعادت کوئی قصور نہیں

کوئی محبِ وطن سر بکف اگر نکلے
تو اس کی ذات سے اُلفت کوئی قصور نہیں
وطن کے واسطے سب کچھ لٹا دیا جس نے
اُس اہلِ دل سے ارادت کوئی قصور نہیں
کسی طرح بھی ہو یہ دیس ہو رہے آزاد
یہ جذبۂ وطنیت کوئی قصور نہیں
کریں گے قوتِ بازو سے ملک کو آزاد
یہ آرزو یہ عقیدت کوئی قصور نہیں
عمل یہی ہے جو آئی این اے سپاہی کا
تو اس پہ جور ہے بیکار بادشاہی کا

یہ وہ نہیں کہ لڑے ہوں جو اپنے تن کے لئے
لڑے ضرور مگر مادرِ وطن کے لئے

غذا نصیب نہ تھی پیٹ بھر کے کھانے کو
نہ پیرہن کو تھا کپڑا نہ تھا کفن کے لئے

وطن کا پاس تھا کچھ جان و دل کا پاس نہ تھا
قدم بڑھا کے چلے بیدریغ رن کے لئے

صعوبتوں میں بھی ماتھے پہ بل نہیں آیا
صد آفریں ہے انھیں ایسے بانکپن کے لئے

طن سے دور دکھائی وطن کو راہِ نجات
سبھاش بوس پہ رحمت ہو اس چلن کے لئے

ار طرح کی مجبوریوں میں کی تنظیم
نہ دے گا داد انھیں کون ایسے فن کے لئے

کچھ امتیاز نہیں فرقہ اور ملّت کا
کہ سرفروشوں میں ہے رابطہ محبت کا

قطعہ

اے شہیدانِ وطن تم سے بڑھی شانِ وطن
قوم کو زندہ کیا ہے ہو کے قربانِ وطن
کب علاجِ قوم ہو تقریر یا تحریر سے
ہاں تمہارے خون میں پنہاں ہے درمانِ وطن

پیامِ آزادی

دیا ہے راہبروں نے پیامِ آزادی
زیادہ دور نہیں ہے مقامِ آزادی

جو رند میکدے کی خیر مانگتے ہی رہے
اُنھیں کے حصّے میں آیا ہی جامِ آزادی

قریب ختم ہے محکومیِ کہن کا نظام
کہ اب ہے پیشِ نظر اہتمامِ آزادی

فکر و خوف

سوکھی شاخیں پھر ہری ہونے لگیں بدلی ہے رُت
چیل کو غم ہے کہ میرا آشیاں مٹ جائے گا
آمدِ فصلِ بہاراں ہے پیامِ زندگی
خوف ہے کانٹوں کو اب اپنا نشاں مٹ جائے گا
بوم و شپّر کے لئے آمد سحر کی قہر ہے
ہے یہ سب بے چینی اندھیرے کا سماں مٹ جائے گا

آہیں بھر بھر کر حریفوں کا یہ کہنا ہے کہ ہائے
اب نظامِ کہنۂ ہندوستاں مٹ جائے گا

اُمّید و بیم

آ رہا ہے پے آزادیِ ہند ایک مشن
بات کچھ شبہہ کی ہی کچھ ہمیں تسلیم بھی ہے

عہدِ ماضی کی ہمیں یاد ہے وعدہ شکنی
عہدِ حاضر کی مگر کچھ ہمیں تعظیم بھی ہے

غیر ملکوں کا پڑا کچھ تو حریفوں پہ دباؤ
اور کچھ اپنی طرف قوتِ تنظیم بھی ہے

سئلہ ہند کا وابستہ ہے اب دنیا سے
اس کی تاخیر میں اک پہلوئے تقدیم بھی ہے

ہے تو آزادیِ کامل انھیں تسلیم مگر
اُن کی تجویز میں اندیشۂ ترمیم بھی ہے

کہیں ایسا نہ ہو اگر وہ کریں ہم سے سوال
لے آزادیِ کامل تمھیں تعلیم بھی ہے

نظر آتا ہی نہیں نقشۂ مستقبل صاف
خوفِ ہنگامہ بھی ہے موقعِ تفہیم بھی ہے

نقشہ درپیش ہے آزادیِ کامل کا مگر
دل کا یہ حال ہے اُمید بھی ہے بیم بھی ہے

جامعہ کی سلور جوبلی کے مشاعرہ میں

سنگِ بنیادِ تمدن اگر ایماں ہوگا
جوہرِ انسان کا ہر ایک نمایاں ہوگا

وحشتِ انساں کی اگر یوں ہی رہی روز افزوں
اپنے ہی ہاتھوں میں اپنا ہی گریباں ہوگا

عقلِ محدود ہی ناواقفِ تکمیلِ حیات
شر جسے کہتے ہیں وہ خیر کا ساماں ہوگا

آج تخریب کی صورت جو نظر آتی ہے
اِسی تخریب میں تعمیر کا ساماں ہوگا

چار تنکے بھی قرینے سے لگانے دشوار
ہم سمجھتے تھے کہ یہ کام تو آساں ہوگا

زیست جب موت کی صورت میں بسر ہوتی ہو
مردِ آزاد کو کیا جینے کا ارماں ہوگا

ہم نشیں ہیں تو نہ مانوں گا یہ کیا بات کہی
وہی ہم ہوں گے وہی خانۂ زنداں ہوگا

آپ کی بات پہ اب کرنے لگا کون یقیں
جو نہ ٹوٹا ہو نہ ایسا کوئی پیماں ہوگا

پاسبانوں نے ابھی تک تو نگہبانی کی
پاسبانوں کا بھی اب کوئی نگہباں ہوگا

شبِ تاریک میں جی چھوڑ نہ بیٹھے کوئی

آفتابِ نظر افروز درخشاں ہوگا

رنگ روغن تو بہت دیکھنے والے ہیں مگر

خاص نظروں کے لئے جوہرِ پنہاں ہوگا



نوائے قفس

(آخر سنہ ۴۲ء سے سنہ ۴۴ء تک)

غزل

شکستہ دلِ ناتواں ہو نہ جائے
کوئی اور بھی امتحاں ہو نہ جائے
کہیں ضبطِ غم رائگاں ہو نہ جائے
جو آنسو تھما ہے رواں ہو نہ جائے
ابھی ہے تحمل کی تکمیل باقی
وہ نامہرباں ہو نہ جائے

باہم مشورے ہوتے ہیں رہزنوں میں
کہیں متحد کارواں ہو نہ جائے

یہ ناصح کا اندازِ پند و نصائح
وبالِ دلِ نیم جاں ہو نہ جائے

یہ پھولوں کا موسم یہ فصلِ بہاراں
غمِ آشیاں پھر جواں ہو نہ جائے

قفس میں نہ اے آمن خاموش بیٹھو
تمھاری طبیعت گراں ہو نہ جائے

ایک بیت

جہاں سے دور یہ فسق و فجور ہونا ہے
نظامِ نو کا تسلط ضرور ہونا ہے

غزل

نہ جب دیر و کلیسا و حرم میں کچھ نشاں دیکھے
تمھارا چاہنے والا کہاں ڈھونڈے کہاں دیکھے
زمیں پر کیوں نہ وہ شخص اپنی محنت رائگاں دیکھے
جو وقتِ امتحاں گھبرا کے سوئے آسماں دیکھے
بھلا بے چارہ انساں کس جگہ شکلِ اماں دیکھے
اُٹھائے جب نظر تو ہر زمیں پر آسماں دیکھے

قفس میں بھی تڑپ بجلی کی دیتی ہے پتہ سب کچھ
تمنا ہی کسے باقی کہ اپنا آشیاں دیکھے

اسیرانِ قفس کی آپ بیتی پوچھتے کیا ہو
یہاں اے امن قزاقوں سے بدتر پاسباں دیکھے

غزل

نہ قابو میں ہے دل اپنا نہ قابو میں زباں اپنی
دھرا کیا ہے فسانے میں مزا کیا ہے ترانے میں

اسیری میں بھی اپنی چشمکوں میں کچھ نہ فرق آیا
وہی جھگڑے قفس میں بھی ہیں جو تھے آشیانے میں

سکونِ دل کی کوئی بھی نظر آتی نہیں صورت
نہ آزادی میں چین آیا نہ آیا قید خانے میں

بتائیں کیا کہ ہم قیدِ قفس میں کس لئے آئے
نظر صیّاد کی تھی اور کشش تھی آب دانے میں

نہ رازِ زندگی ظاہر نہ رازِ موت ظاہر ہے
خدا جانے ہے کیسا انتظام اس کارخانے میں

مکمل داستاں آزادیِ کامل کی ہوتی ہے
لہو کی سرخیاں اے امن ہوں گی اِس فسانے میں

غزل

شوقِ ثواب کچھ نہیں خوفِ عذاب کچھ نہیں
جس میں نہ ہو عمل کا جوش اُس کا شباب کچھ نہیں

زندگی اک سوال ہے جس کا جواب موت ہے
موت بھی اک سوال ہے جس کا جواب کچھ نہیں

نغمۂ نو کے واسطے غیر کی احتیاج کیا
چھیڑ دے تارِ سازِ دل چنگ و رباب کچھ نہیں

صاف دلوں کے واسطے تنگ ہے عرصۂ حیات
ذاتِ حباب خوب ہے عمرِ حباب کچھ نہیں
برہمن اور شیخ میں جھگڑے یہی ہیں رات دن
تیری کتاب کچھ نہیں، تیری کتاب کچھ نہیں
رات کو میکدے میں کل تھی کسی مست کی صدا
ایک نظر کا رنگ ہے۔ رنگِ شراب کچھ نہیں

کوئل کی کوک اور سنیما کے گانے

کالی کوئل کی صدا اور کچھ سنیماؤں کے گیت
یہ صدائیں جب میں سنتا ہوں اکثر وقتِ شام

گیت ہے مرہونِ ساز اور کوک ہی معمورِ سوز
اس میں ہی بیساختہ پن اور اُس میں اہتمام

"میری جاں اور میرے پیارے" میں کہاں وہ لطف ہے
ہے "کوہو" کی مختصر بولی میں جس کا اِلتزام

فرق اک عالم کا ہے اس سوز اور اس ساز میں

اُس میں ہے بوئے غلامی اس میں آزادیٔ تام

فرشِ مخمل جامِ مے محلوں میں رہنا اُس طرف

اِس طرف ہے بے تکلف ایک ٹہنی پر قیام

دام سے یہ بے نیاز اور اُس کی قیمت شرمناک

وہ صدا وقفِ تجارت اور اِس میں اک پیام

وہ صدا ہے واہ کی اور یہ صدا ہے آہ کی

فرق دونوں کا سمجھ سکتے ہیں اہلِ دل تمام

پوچھنا کیا ہم قفس میں یہ سُنوں یا وہ سُنوں

اس قفس میں ہر نفس آزادے کا ہوں غلام

دل کی چوٹ

یہ ہنسی بھی کوئی ہنسی ٹھہری

ہنستے ہنستے بھی جی بھر آتا ہے

مسکراہٹ سے درد ہے پیدا

کوئی دل کو دکھائے جاتا ہے

اُبھر آتی ہیں دل کی سب چوٹیں

جب کوئی وقتِ صبح گاتا ہے

شعر کی داد مُنہ سے کیا دینا
اشک آنکھوں میں جھلملاتا ہے

کہنے سُننے کا کچھ نہیں یارا
اِس طرح بھی کوئی ستاتا ہے

ایک شعر

یہ کیا خوب اک فلسفی نے کہا ہے
جہالت تکبّر کی پہلی سزا ہے

غزل

ہے بستی جب ہر ایک منظر تو کیا کہیں کیا ہے کیا نہیں ہے
دماغ و دل کی جو کشمکش ہے کچھ اس کا عقدہ کھُلا نہیں ہے

سراب کو موجِ آب سمجھے اور آب کو ہم سراب سمجھے
نگاہِ مسحور کی خطا ہے یہ کوئی دل کی خطا نہیں ہے

نظر بھی قاصر قدم بھی شل ہیں غضب ہیں پھر دل کی یہ صدائیں
ابھی تو کتنی ہی منزلیں ہیں ابھی ٹھہرنا روا نہیں ہے

خبر نہیں کچھ کہ تا بہ منزل رسائی ہو گی تو کس طرح سے
اُدھر ہی چلنی ہے راہ مجھ کو جدھر کوئی نقشِ پا نہیں ہے

حقیقتوں پر نگاہ رکھو سنبھالے رکھو دل و جگر کو
ابھی سے کیا انتہا کی باتیں ابھی تو یہ ابتدا نہیں ہے

بہت سے الفاظ ملتے جلتے ہمارے اُن کے کلام میں ہیں
مگر جو غیروں کا مدّعا ہے ہمارا وہ مدّعا نہیں ہے

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے یہ کہہ رہی ہیں نئی ہوائیں
کہ وہ بھی ہونے کو ہے جہاں میں جو کچھ ابھی تک ہُوا نہیں ہے

نگاہ کی اور دل کی تنگی خیال باطل اُمید بے جا
یہی تو ہنگامۂ جہاں ہے کچھ اور اس کے سوا نہیں ہے

غزل

اُمیدیں تو وابستہ ہیں ابرِ تر سے

جو برسے تو برسے نہ برسے نہ برسے

زمانے سے یہ بھی تعجّب نہیں ہے

کہ نغمہ ہو پیدا اِسی شور و شر سے

جہاں کیا ہے اور اس کی رنگینیاں کیا

یہ پوچھو کسی دیدۂ حق نگر سے

زبان و دہن سے جو کھُلتے نہیں ہیں
وہ کھُل جاتے ہیں راز اکثر نظر سے

کہا شیخ سے ایک پیرِ مغاں نے
کہ ہر اک کو دیکھو اُسی کی نظر سے

مرے دِل کی یہ تیرگی کیسے جائے
منّور نہ ہوگا یہ شمس و قمر سے

مرا راستہ کارواں سے الگ ہے
گذرنا ہے اک منزلِ پُرخطر سے

یہ ہے اَمنؔ انساں کی پستی سی پستی
گنہ سے بچا بھی تو دوزخ کے ڈر سے

غزل

یہ کوششیں ہیں عبث عمرِ جاوداں کے لئے
وہی ہے زیست جو ہو وقف امتحاں کے لئے
کہیں اسی میں نہ مضمر ہو زندگیِ چمن
جو برق کوندتی ہے میرے آشیاں کے لئے
چمن میں آگ لگی ہے اُدھر کا رُخ نہ کرو
یہ وقت راس نہیں سیرِ گلستاں کے لئے

وکم ہے شورِ سلاسل جنوں تو زندہ ہے
حقیقتاً ابھی خطرہ ہے پاسباں کے لئے

بہار سمجھے ہو جس کو وہ ہے فریبِ نظر
ہے دِل میں اپنے تڑپ آمدِ خزاں کے لئے

ابھی سے سُست نہ ہو جائیں قافلے والے
ابھی تو اور بھی منزل ہے کارواں کے لئے

شہیدانِ وطن

شہیدوں کا بیاں کرتے لرزتی ہے زباں میری
کہاں وہ حوصلہ اُن کا کہاں تابِ بیاں میری
شہادت اِرتقائے زیست میں آخر کی منزل ہے
امینِ دورِ نو ہر اک شہیدِ قوم کا دل ہے
گذر جاتی ہے جب حد سے کسی بھی قوم کی پستی
پیامِ زیست لاتی ہے شہیدِ قوم کی ہستی

جماعت زندہ ہوگی فرد کے قربان ہونے سے
ثباتِ مردمی ہے مرد کے قربان ہونے سے
شہیدانِ وطن چیں بر جبیں ہوتے نہ روتے ہیں
وہ ہنستے ہنستے ملک و قوم پر قربان ہوتے ہیں
شہیدوں ہی سے ہے تاریخ کے ابواب کی زینت
شہیدوں ہی سے ہے اس عالمِ اسباب کی زینت
جب آزادی کے دن ہندوستاں میں پھر سے آئیں گے
شہیدانِ وطن کے کارنامے لکھے جائیں گے

غزل

عمل کا حُسن استقلال سے ہے این و آں کب تک

غمِ انجام اور اندیشۂ سود و زیاں کب تک

زباں آخر نہ ہوگی حالِ دل کی ترجماں کب تک

"لگی ہو آگ جب دل میں نہ نکلے گا دُھواں کب تک"

یہ شیخ و برہمن میں روز بحثِ ایں و آں کب تک

بہم آویزشِ آوازِ ناقوس و اذاں کب تک

حقیقت کھل ہی جائے گی اگر کچھ بھی حقیقت ہے
رہے گا رازِ ہستی سات پردوں میں نہاں کب تک

مرے خالق تری مخلوق بھوکی مرتی جاتی ہے
کہے جاؤں تجھے پروردگارِ دو جہاں کب تک

کچھ اپنا مرتبہ جانو کچھ اپنی قدر پہچانو
زمیں پر بسنے والو شکوۂ ہفت آسماں کب تک

ہوا کے رُخ پہ اُڑتی خاکِ منزل کیا بتائے گی
کرے گا رہنمائی۔ یہ غبارِ کارواں کب تک

نشیمن پر ابھی ہے خانۂ صیّاد کا سایہ
یہ محکومی یہ مجبوری نصیبِ دشمناں کب تک

مجھے کیا فائدہ اس سے کہ صیّادوں کی بدلی ہو
مرا ہندوستاں ہوگا مرا ہندوستاں کب تک

اگر بچ بھی رہا صیاد سے صرصر سے بجلی سے
رہے گا کھوکھلی ٹہنی پہ قائم آشیاں کب تک
یقیں ہے گھر کرے گی دل میں دشمن کے وفا میری
کوئی اے آمن مجھ سے رہ سکے گا بدگماں کب تک

غزل

کوئی حد بھی ہے آخر امتحاں کی
الٰہی خیر قلبِ ناتواں کی

یہ ہے اِک مُہر بے بال و پری پر
رہائی بھی رہائی ہے کہاں کی

خزاں کا وسوسہ ہے فصلِ گُل میں
ضرورت ہے بہارِ بے خزاں کی

زمیں پر ہیں وہ کچھ مٹی کے پُتلے
کہ جن میں رفعتیں ہیں آسماں کی

عید

رہنا مِل جُل کے نیک مردوں کا ہی کام
اُلفت سے بندھا ہے ساری ہستی کا نِظام
یہ عید مبارک ہو تمھیں اہلِ قفس
ہے عید کا پیغام ہی گاندھی کا پیام

اُمید وہ کیا جو ہو کے پوری نہ رہے
ہندو مسلم میں کوئی دُوری نہ رہے
یہ کیا کہ کوئی منائے کوئی نہ منائے
ہولی ہو کہ عید ہو ادھوری نہ رہے

پہلا سا کہاں عید منانا باقی
اے امن کہاں ہے وہ زمانہ باقی
پہلے تو گلے ملتے تھے تیوہاروں میں
اِس دَور میں ہے ہاتھ مِلانا باقی

غزل

یہ میکش کون باصد لغزشِ مستانہ آتا ہے
اشارے ہوتے ہیں وہ رونقِ میخانہ آتا ہے
کبھی صحرا کی رونق کم نہیں ہوتی نہیں ہوتی
کوئی دیوانہ جاتا ہے، کوئی دیوانہ آتا ہے
تمھاری بزم بھی کیا بزم ہے آداب ہیں کیسے
وہی مقبول ہوتا ہے جو گستاخانہ آتا ہے

کہانی اپنی اپنی اہلِ محفل جب سناتے ہیں
مجھے بھی یاد اک بھولا ہوا افسانہ آتا ہے
بہت پروانے جل جل کر مرے اس بزم میں اب تک
بجھانے شمع کو بھی کیا کوئی پروانہ آتا ہے
دُعا تیری ترے منتر بھلا مقبول کیا ہوں گے
بدی دل میں لئے سوئے عبادت خانہ آتا ہے
ہوائے تازہ ابرِ تر فزوں جوشِ نمو لیکن
نصیبِ دشمناں ہے کھیت میں جو دانہ آتا ہے
ہر اک ٹھوکر پہ ہے اے اُمَن لغزش کا گماں مجھ کو
ہر اک پتھر نظر سنگِ درِ میخانہ آتا ہے

غزل

کہا جھنجھلا کے اہلِ قافلہ سے ایک رہبر نے
ابھی تو پہلی منزل ہے ابھی سے کیوں لگے ڈرنے

مکمل داستاں کا اختصار اتنا ہی کافی ہے
سُلایا شورِ دنیا نے جگایا شورِ محشر نے

سرِ دیوارِ زنداں چاندنی چھنتی تھی پتّوں میں
دیا تھا قید میں کیا لُطف ایسی شب کے منظر نے

زمیں پر دیکھئے کیا ہو گئے ہیں چرخ سے اب تک
بلندیِ نظر کے سو تقاضے ماہ و اختر نے
وہ ہیں ناواقفِ آدابِ اُلفت اور کیا کہیے
جو آگے ناشناسِ درد کے آہیں لگے بھرنے
ہے جتنی مختصر دنیا ہے اُتنا اور ہنگامہ
قفس میں تو حوادث سے لگے ہیں اور بھی ڈرنے
زمانے کی کشاکش کا دیا پیہم پتہ مجھ کو
کہیں ٹوٹے ہوئے دل نے کہیں ٹوٹے ہوئے سر نے
ہیں کتنی مختلف باہم طبائعِ نسلِ انساں کی
رہے معذور اب تک جو چلے تھے تجزیے کرنے
سخن اندازۂ عقلِ مخاطب سے مناسب ہی
کوئی کیوں کیسۂ دلاک میں موتی لگے بھرنے

فدائے رنگ و روغن سطح بیں سے کیا غرض اُس کو
جگہ دی جس کسی کو چشم و دِل میں اہلِ جوہر نے

جیل میں بسنت

اگرچہ مژدۂ فصلِ بہار لائی ہے
خزاں کے دور میں اب کے بسنت آئی ہے
خُدا ہی جانے کہ برسے گا خوں کہ آبِ حیات
گھٹا تو آج ہمارے سروں پہ چھائی ہے
ہے ایک جامِ بلوریں تو سامنے لیکن
شراب ہے کہ ہے سم رنگ تو حنائی ہے

صدائیں آتو رہی ہیں ہمارے کانوں میں
یہ قافلہ ہے کہ رہزن کی عشوہ زائی ہے
نہ جانے درد کے گانے ہیں یا خوشی کا سرور
نواطراز نے مضراب تو اُٹھائی ہے

کسی ادائے تبسم سے ہوں میں حیرت میں
ہے اس میں طنز کہ اُلفت کی رونمائی ہے
غرض کہ کچھ نہیں آتا سمجھ میں کیا ہوگا
بنے گی جان پہ یا بات ہی بن آئی ہے۔

عالمِ یاس میں شکوہ

نگہ و دل میں اضطراب کہاں
اب وہ کیفیتِ شباب کہاں
عاقبت کا خیال آتا ہے
ذوقِ مستی کہاں شراب کہاں
اب کہاں شوقِ نغمہ پیرائی
چنگ اور نے کہاں رباب کہاں

خلوتِ خاص ہو کہ راہگذر
آنکھ میں حسنِ انتخاب کہاں

کچھ خیالوں کے بُت سو وہ بدروپ
من کے مندر میں آب تاب کہاں

ہر سکوں موت کی علامت ہے
دل تو ہے دل میں اضطراب کہاں

آنکھ اَب حالِ دل نہیں کہتی
گرمیِ سعیِ بے حساب کہاں

کتنی حسرت سے امّن کہتا ہے
اب وہ کیفیتِ شباب کہاں

قطعہ

جس میں نہ اُمید ہو وہ ہستی کیسی
دِل میں تنگی نظر میں پستی کیسی
جی چھوٹ گیا اگر حوادث میں ترا
اے امنؔ یہ تیری حق پرستی کیسی

کوئل

کنجِ قفس میں آج سویرے | آئی صدا کانوں میں میرے
کوہو کوہو کُہو کُہو کی | وجد میں لانے والی بولی
نشتر ہے آواز نہیں ہے | سوز ہے اس میں ساز نہیں ہے
بول رہی ہے کوئل کالی | مطرب کو شرمانے والی
کوہو کوہو بولے ہی جا | دل کی گرہیں کھولے ہی جا
خوب سُنے ہیں گانے والے | تان الاپ اُڑانے والے

اُن میں تو یہ بات نہ پائی
دِل کھنچتا جاتا ہی دُہائی
دل تڑپانے والی کوئل
تیری شان نرالی کوئل
کس نے تجھے یہ گیت سکھایا
یہ انداز کہاں سے پایا
غالب نے کیا خوب کہا ہی
نالہ نہیں ہی پابندِ نے
گیت میں تیرے ہو جو بناوٹ
پھر یہ اثر ہوا ور نہ لگاوٹ
پیڑ کی اک ٹہنی پر گانا
پتوں میں چھپتا ہے ترانہ
جاڑے میں خاموش رہی تو
یہ کیوں کیا بے ہوش رہی تو
جاڑے میں بے وقت تھا گانا
پت جھڑ میں کیا تان اُڑانا
بادل جب گھِر کر آتے ہیں
تب تجھ کو گاتے پاتے ہیں
میری فطرت تجھ سے جُدا ہی
میری خصلت تجھ سی جُدا ہی
جب پتے پیلے ہوتے ہیں
تب میرے گانے ہوتے ہیں
تو آزادی میں گاتی ہے
نغمے فضا میں پھیلاتی ہی

کوئی نہ لایا تجھ کو بس میں — تو نہیں آتی کنجِ قفس میں

قید میں رہ کر گاتا ہوں میں — آفت سہہ کر گاتا ہوں میں

میں ہوں قید قفس کے اندر — تو آزاد اونچی ٹہنی پر

میں آزاد جو ہو جاؤں گا — پھر بھی گھروِل ہی میں گاؤں گا

تیرے گیت آزاد رہیں گے — موجِ ہوا کے ساتھ بہیں گے

غزل

کسی کو دہر میں انجام بیں نظر نہ ملے
اسی میں خیر ہے آخر کی کچھ خبر نہ ملے
سُنا ہے اُن سے ملاقات ہو گی محشر میں
ہے ایک اور قیامت وہاں اگر نہ ملے
مِلا ہے جب سے مزہ غم کا یہ دعا ہی مری
کہ کچھ مِلے مرے دشمن کو چشم تر نہ ملے

کہیں فرشتے ملے اور کہیں ملے شیطان
ہو جن میں شانِ توازن کی وہ بشر نہ ملے

۱۹۴۲ء کی تحریک

کاروانِ منزل

نہ منزلوں کے کچھ نشاں نہ راہبر نہ رہنما
یہ نذرِ راہزن ہوئے وہ دھند میں کہیں گم
مگر یہ کارواں چلا رواں دواں رواں دواں
دلوں میں جوشِ بیکراں لبوں پہ تھا بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو

صداؤں سے جو دِل بڑھے قدم بڑھے

صد آفریں صد آفریں

روانگی میں زور تھا

زمین تھر تھرا گئی، کُہر بھی چھنٹ گیا ذرا
تمام اہلِ کارواں پُکار اُٹھے قریب ہیں

قریب ہیں قریب ہیں

زِبس تھا راستہ کٹھن قدم قدم پہ راہزن
کہیں تو خارِ خشک تھے کہیں پہ گرم ریت تھی
بہت چلا بہت چلا، مگر یہ کارواں تھکا

وہ زورِ شور گھٹ گیا وہ ولولے بھی کم ہوئے
قدم میں لغزشیں ہوئیں خیالِ راہبر ہوا

تلاش کیجئے اُسے مگر کہیں پتہ نہیں
مقامِ غور و فکر ہے

وہ دشمنانِ جوش جن کا غور و فکر نام ہے
مسافروں کے واسطے ہمیشہ سنگِ راہ ہیں
کچھ اہلِ کارواں ابھی تھکے نہیں یہ خیر ہے
وہ دشمنانِ فکر ہیں

صدائیں اُن کی ہیں یہی ابھی ذرا بڑھے چلو
کہ رہزنانِ راہزن بھی ہیں کہیں
جنھیں کچھ انتظار ہے
قدم بڑھا کے تم چلے مگر یہ اِک کسر رہی

قدم ذرا ملے نہیں

اگر قدم ملے رہیں تو چاہے سست رَو بھی ہوں

رسائی ہوگی ایک دن

صدا یہ سُن کے کارواں چلا ہے پھر اُمنگ سے

اِنے گنے ہیں راہرو مگر ہے عزم مستقل

رواں نہیں رواں ہیں یہ مگر قدم مِلے ہوئے

تکان بھی ہے شوق بھی

خدا ہی جانے ہوگا کیا

عجب نہیں یہ کارواں گرے پڑے مرے کھپے

مگر یہ ایک جنوں زدہ کی ہے صدا

کہ منزلیں بھی کھنچ کے راہرو کی سمت آتی ہیں

غزل

ڈراتی کیا ہے رہ رہ کر تو اے برقِ طپاں مجھ کو
قفس میں کچھ نہیں فکرِ مآلِ آشیاں مجھ کو

نہ دے دھوکے پہ دھوکا اے غبارِ کارواں مجھ کو
نظر آنے لگے ہیں اب تو منزل کے نشاں مجھ کو

قفس میں جا کے ملنا ہے پُرانے ہم صفیروں سے
بنائے آشیاں رکھنے کی فرصت ہی کہاں مجھ کو

گلوں سے کر دیا خالی چمن یہ کیا قیامت ہے
پسِ مردن رہے گا یاد جورِ باغباں مجھ کو
کبھی تو دام میں لایا کبھی پنجرے میں پہنچایا
یہ اُلٹا لے چلا ہے ذوقِ آزادی کہاں مجھ کو
میں آدابِ فنا کے سیکھنے کا دل سے قائل ہوں
نہیں درکار تعریفِ حیاتِ جاوداں مجھ کو
میں اپنا جائزہ لیتا ہوں دنیا کے حوادث میں
پیامِ زندگی ہے دعوتِ ہر امتحاں مجھ کو
سکوں شورِ سلاسل کا رہائی کا سبب ٹھہرا
کہ غفلت پاسباں نے کی سمجھ کر ناتواں مجھ کو
وہ شاید رہنمائی کر کے آگے چل دیا سب سے
نظر آتا نہیں رہبر قریبِ کارواں مجھ کو

شکستہ دل کہے کیا بات خوش حالوں کی محفل میں
نہ ہے تابِ بیاں مجھ میں نہ ہی ذوقِ بیاں مجھ کو
مجھے تو غیر سے اے امنؔ اتنی بات کہنی ہے
مبارک ہو تجھے برطانیہ ہندوستاں مجھ کو

گیت

اب ہم سے رہنا دور دور

تم کو ثابت ہی رہنا ہی ہم کو ہونا ہے چور چور

ہم نے کچھ اور بچارا ہی تم نے کچھ اور بچارا ہے

ہم جن سے آنکھ ملائیں گے تم اُن سی کہنا جی حضور

ہم اُلٹی باتیں کرتے ہیں جینے کی خاطر مرتے ہیں

کیا ہم سے مرنے والے کو تم دیکھ رہے ہو گھور گھور

ہم جان رہے ہیں تم کیا ہو تم ہم کو جو چاہو سمجھو
ہم کو اپنوں سے پریم سدا تم کو غیروں پر ہے غرور
ہم جانے کیا کیا جھیلیں گے ہم انگاروں سے کھیلیں گے
تم شیتل رہنے والے ہو ان لپٹوں سے بچنا ضرور

غزل یا نظم

جن دنوں زور مرے ناخن تدبیر میں تھا
داغ محکومیِ پیہم کا نہ تقدیر میں تھا

کوئی غفلت کوئی وعدہ کوئی دھمکی سمجھا
لطف کل رات یہ اس شوخ کی تقریر میں تھا

دم آخر بھی رہا مجھ کو رہائی کا خیال
ایسا دھوکا مرے صیّاد کی تقریر میں تھا

جان دے دی کہ مجھے شوق تھا سرتابی کا
لطفِ تقصیر نہاں شدتِ تعزیر میں تھا
آج ہر قسم کی جھنکار سے خوش ہوتا ہے
وہی دیوانہ جو کل بندشِ زنجیر میں تھا



آغاز جنگ عظیم

سے

سنہ ۴۲ء کی تحریک تک

گلشن میں جو ہونا ہے وہ ہو لینے دے اِک بار
اے مُرغِ گرفتار خبردار خبردار

تو کچھ دِنوں پنجرے میں ابھی اور بھی رہ لے
جو کچھ تجھے کہنا ہے وہ صیاد سے کہہ لے
پنجرے سے نہ ہرگز تو کسی غیر کو للکار
اے مرغِ گرفتار خبردار خبردار

ہاں پنجرے کی تیلی کو اُلٹنے کا جتن کر
ٹوٹے جو قفس عزم سوئے صحنِ چمن کر
پنجرے میں تو کس بل کی نمائش ہے یہ بیکار
اے مرغِ گرفتار خبردار خبردار

غزل

کل تھا کمال آج ہمارا زوال ہے
کیا شکوہ کیجئے یہ زمانے کی چال ہے

ہر ہر قدم پہ اک عملِ انفصال ہے
جو چال آپ کی ہے قیامت کی چال ہے

میری جبیں پہ جو عرقِ انفعال ہے
ناکامیوں کے دور کی تصویرِ حال ہے

فتنے برس رہے ہیں نگاہوں سے آپ کی
میں خوب جانتا ہوں جو یہ دیکھ بھال ہے
عرض اور التجاؤں کی اک حد بھی ہے حضور
دستِ عمل بنے گا جو دستِ سوال ہے
اُن کا خیال اور ہے اپنا خیال اور
اب اُن کی بزم میں مرا رہنا محال ہے
بیگانے جو شروع سے ہیں اُن کا ذکر کیا
اپنے بھی غیر ہو گئے اِس کا ملال ہے
ابرو پہ چیں جبیں پہ شکن بے سبب نہیں
معلوم ہے اُنھیں جو ہمارا سوال ہے
جوشِ عمل تو دل میں ہے تابِ عمل نہیں
اے احسنؔ یہ بتاؤ کہ اب کیا خیال ہے

غزل

زندگی بے خطر پسند نہیں ‏ ‏ پُر سکوں رہگذر پسند نہیں
انقلابات چاہتا ہوں میں ‏ ‏ کوئی سیدھی نظر پسند نہیں
کوئی ہنگامہ تازہ برپا ہو ‏ ‏ ہے تو اچھا مگر پسند نہیں
جس میں بیداریوں کا ہو پیغام ‏ ‏ ہائے ایسی سحر پسند نہیں
جس کی منزل کوئی معین ہو ‏ ‏ ایسا اوچھا سفر پسند نہیں
ہو وہ ناقوس یا اذاں کی صدا ‏ ‏ شور منظور شر پسند نہیں

سرِ مقتل کوئی یہ کہتا ہے　　نہ ہو سودا تو سر پسند نہیں
شوقِ پرواز ہی مگر یہ حال　　جنبشِ بال و پر پسند نہیں

پیامِ اُمید

مژدہ اے مزدور دورِ انقلاب آنے کو ہے
تیری پژمردہ اُمیدوں پر شباب آنے کو ہے
آج تک جتنی دعائیں کی ہیں تو نے اے کسان
جلد ہی اِن سب دُعاؤں کا جواب آنے کو ہے
آج تک رکھا ہے جس نے تجھ کو پابندِ ستم
سامنے تیرے وہ باحالِ خراب آنے کو ہے

اے کہ تیری بے کسی وجہِ سکوں اب تک رہی

تجھ پہ رحمت جور کاروں پر عذاب آنے کو ہے

آنکھ اُٹھا کر دیکھ اے مایوس حسنِ زندگی

چھنٹ گئے بادل نظر پھر آفتاب آنے کو ہے

اہلِ دل کو ایک مدّت سے تھا جس کا انتظار

دَور وہ آنے کو ہے اب وہ شتاب آنے کو ہے

غزل

ہمارے ہاتھ اگر نظمِ چمن کا اختیار آئے
ابھی فصلِ خزاں جائے ابھی فصلِ بہار آئے

اسے خوش بختیِ صیاد کہیئے اور کیا کہیئے
اگر قیدِ قفس میں بھی کسی دل کو قرار آئے

خس و خاشاک دُھل جائیں گلوں کے چہرے کھِل جائیں
الٰہی گلشنِ ہندوستاں میں پھر بہار آئے

اُٹھو دیکھو تمھارا خون کیا کیا رنگ لایا ہے

سرِ گورِ شہیدانِ وطن ہم یہ پکار آئے

سہی جاتی نہیں ہیں مشکلیں ہر روز کی ہم سے

مصیبت جو بھی آنی ہو الٰہی ایک بار آئے

اِسے بھی ہم سمجھتے ہیں کہ قسمت کی رسائی ہے

جو اپنا تذکرہ محفل میں اُن کی بار بار آئے

کبھی کچھ اور کہتے ہو کبھی کچھ اور کہتے ہو

تمھاری بات پر دنیا کو کیسے اعتبار آئے

یہ اہلِ قافلہ سے قافلہ سالار کہتا ہے

نہ ماتھے پر شکن آئے نہ دل میں کچھ غبار آئے

تمھیں معلوم کیا گذری ہے کیا کیا حق پرستوں پر

رہے کچھ قیدِ زنداں میں تو کچھ زیرِ مزار آئے

یہ بولے اہلِ مغرب دیکھ کر مہندی کو یوروپ میں
غلام آباد سے بن کر بڑے اہلِ وقار آئے
ہمیں میداں ہمیں چوگاں یہ ہے آواز قاتل کی
سرِ مقتل جسے آنا ہو وہ مردانہ وار آئے

غزل

ہے سکوں کا لمحہ پیغامِ قضا میرے لئے
ہر تلاطم کا عمل ہے جاں فزا میرے لئے

بندہ پرور یوں تو ہوتے ہیں ستم اوروں پہ بھی
ہے مگر مخصوص کچھ جور و جفا میرے لئے

آپ تو ہر رسم ہر آئین سے آزاد ہیں
اور یہ پابندیِ رسمِ وفا میرے لئے

آشیاں میں رہ کے پیش آتی ہیں لاکھوں آفتیں
کچھ قفس ہی میں موافق تھی ہوا میرے لئے

زندگی کی منزلوں میں ہوں میں وہ غربت زدہ
راہزن خود بن رہا ہے رہنما میرے لئے

بندۂ مجبور کا ماضی و مستقبل ہی کیا
ایک سی ہے ابتدا اور انتہا میرے لئے

جنگ

فضائے آسماں سے بے گنہ بندوں پہ بمباری
فنا کوشی کی خاطر نسلِ انسانی کی تیار

یہ انسانوں کے اندر جذبۂ وحشت ارے توبہ
درندوں کی سی انسانوں کی یہ خصلت ارے ا

جہاں گل رنگ رلیاں تھیں وہاں ہے آج ویرانہ
زمانہ لکھ رہا ہے خون کے حرفوں میں افسا

بہانا خونِ انساں دورِ موجودہ کا اک فن ہے
تباہی ہاں تباہی مشرق و مغرب میں قدغن ہے
وہی سائنس جس پر اہلِ یورپ ناز کرتے تھے
وہی تہذیب خونی مغربی دم جس کا بھرتے تھے
سراسر آج بے پردہ سراپا آج ننگی ہے
تمدن کیا ادب کیا سب فضا جنگی ہی جنگی ہے
اُٹھا اے ہندی روایاتِ کہن کو تازہ تر کر دے
پیالہ پریم کا اُجڑی ہوئی محفل میں بھر کر دے
سُنا پھر سازِ مشرق پر محبت کی وہی تانیں
کہ دنیا والے پھر ہندوستاں کی رہبری مانیں

کِسان

وہ جا رہا ہے اندھیرے میں ہل اُٹھائے ہوئے
نگاہ نیچی کئے اور قدم بڑھائے ہوئے
وہ گنگنا رہا ہے بیلوں کو تِکتکانے کے ساتھ
ہزار صدموں کو اک گیت میں چھپائے ہوئے
جہاں کو پھونک سکے جس کی ایک چنگاری
اُس آگ کو تہہ دامانِ دل دبائے ہوئے

قیاس بھی نہیں ممکن ہے شہر میں جن کا
اُمید و بیم کی وہ بستیاں بسائے ہوئے
وہ حُسن و عشق کی نیرنگیوں سے ناواقف
ستم شعاریِ دوراں کی چوٹ کھائے ہوئے
خیال ہے کہ وہ بچے ہیں جاگنے والے
جو بھوکے پیٹ ہیں کل شام سے سُلائے ہوئے
نظر اُٹھا کے کبھی دیکھتا ہے چرخ کی سمت
کہ ٹکڑے ابر کے کچھ چرخ پر ہیں آئے ہوئے
پھٹی ہی دھوتی ہے تن پر پھٹا سا کرتہ ہے
اُدھڑ چلے ہیں جو پیوند تھے لگائے ہوئے
وہ زندگی جسے کہتے ہیں لوگ رحمتِ حق
تمام زحمت و افلاس میں گنوائے ہوئے

مری نظر میں یہ اُن سے بہت بلند ہی امین
جو لوگ دیر و حرم میں ہیں سر جھکائے ہوئے

جنگ پر ایک نفسیاتی نظر

علم نے ترقی کی بے نیازِ دل ہو کر
رہ گئی ہر اک قوت رہنِ آب و گل ہو کر
فرد کا جو تھا جذبہ قوم میں اُبھر آیا
علم بربریت کو اور جوش میں لا یا
دل پہ چھائی بیرنگی وحشتوں پہ رنگ آیا
خبث سطح پر آیا یعنی وقتِ جنگ آیا

دُھن ہوئی سوار ایسی اپنی کامرانی کی
تُل گئیں ہلاکت پر قوتیں جوانی کی
مصلحت کی شدت نے کھو دیا ثوابوں کو
دعوتیں خرد نے دیں خوشنما عذابوں کو
کل جو شہر بستا تھا آج کیسا سُونا ہے
جنگ کا یہ منظر کیا حشر کا نمونہ ہے
پیر ہوں کہ بچے ہوں سب پہ بم برستے ہیں
کھانے پینے سونے کو بے طرح ترستے ہیں
عشرتوں کا خمیازہ کس قدر گراں نکلا
عیش کوشیوں سے ہی رنج بیکراں نکلا
ظلم کے اداروں کے مٹنے کی ضرورت ہے
قدرِ آدمیت ہو یہ سُکوں کی صورت ہے

ایک مردِ اعظم ہے عافیت کا شیدائی
یک دلی کا دیوانہ خیر کوش سودائی
وقت پر جنوں اس کا تازہ رنگ لائے گا
بعد اس خزاں کے پھر موسمِ گُل آئے گا

تضمین

شہیدانِ وطن کی گور سے آواز آئی ہے
وہی ہم سے ملے آ کر جو اپنی جان پر کھیلے
اُدھر دُنیا کی راحت ہے اِدھر لطفِ شہادت ہے
یہ سودا تیرے آگے ہی جو تو چاہے وہی لے لے
یہ ہی جنسِ گراں قیمت سہولت سے نہیں ملتی
جو آزادی کا خواہاں ہو وہ پہلے اپنا سر دے لے

ہزاروں ہی سلام ایسے فدائے ملک و ملت پر

فلاحِ قوم کی خاطر جو پیہم سختیاں جھیلے

کڑی جھیلی سہیں قیدیں چڑھے پھانسی پہ ہنس ہنس کر

شہادت کا سبق لینا ہی جس جس کو وہ اِن سے لے

مقولہ بسملِ[۵] مرحوم کا یہ ہر زباں پر ہے

"شہیدوں کی چتاؤں پر جُڑیں گے ہر برس میلے

وطن پر مرنے والوں کے یہی باقی نشاں ہوں گے"

۵؎ رام پرشاد بسملؔ

عالمِ یاس میں

مری زندگی بھی کوئی زندگی ہے
مجھے ہم نفس اس سی شرمندگی ہے

نہ تابِ عمل ہے نہ جوشِ عمل ہے
مری زندگی اب خموشِ عمل ہے

اولوالعزمیاں ہیں نہ وہ ولولے ہیں
ارادے بھی بے جان سی ہو چلے ہیں

سنہ ۱۹۳۱ء

سے

دوسری جنگ عظیم کے آغاز

تک

وہی دل ہے میرا، وہی جان میری
مگر خاک باقی نہیں آن میری
ترقی نہ بہبود کی آس ہے اب
سخن میں مرے پہلوئے یاس ہے اب
یہ سچ ہے مرا جسم اب تک وہی ہے
مگر دِل میں افسردگی آگئی ہے
ابھی سال بھر پہلے کی ہیں یہ باتیں
نہ دِن دِن کو سمجھا نہ راتوں کو راتیں
اِرادوں میں قوت تھی دِل میں جوانی
عمل کا مرقع مری زِندگانی
مجھے بیٹھ جانا سُکوں سے گراں تھا
کبھی میں کبھی میرا خامہ رَواں تھا

مگر اس کا ردِ عمل کیا غضب ہے

شب و روز آرام کی اب طلب ہے

کہوں کیوں کہ ہوں موت آنے کا طالب

ہوس زیست کی اب بھی ہے مجھ پہ غالب

سو میں سانس اب بھی لئے جا رہا ہوں

جئے جا رہا ہوں، جئے جا رہا ہوں[1]

---

[1] پہلے اور آخری مصرعہ کا توارد ہے پہلا مصرعہ کسی فلمی گیت کا ہے جو اس نظم کے بعد رائج ہوا اور آخری مصرعہ غالباً حضرت جگر کا ہے۔

زِندگی

اُمیدوں ہی میں جانِ زندگی ہے
تمنا پاسبانِ زِندگی ہے
رہے جوشِ عمل دِل میں مُسلسل
یہی روح و روانِ زِندگی ہے
نہیں باقی جو سر میں کوئی سودا
تو پھر کیا خاک شانِ زندگی ہے

وہ زندہ کیا ہے جس کا بجھ گیا دِل
سراسر نوحہ خوانِ زِندگی ہے

مُسلسل ہے سفر مفقود منزل
یہ کیسا کاروانِ زِندگی ہے

نتیجہ کچھ نہیں جس کا نِکلتا
کچھ ایسا امتحانِ زِندگی ہے

نظر ہو وقفِ مستقبل بہر حال
یہی رازِ نہانِ زِندگی ہے

رہے قائم اسیر و جنبش پر
قفس میں یہ نشانِ زِندگی ہے

غزل یا نظم کب ہے گفتۂ امن
سراسر داستانِ زندگی ہے

حقیقی زندگی

عبث بغیر تلاطم کے زندگانی ہے
سکوں پذیر جوانی کوئی جوانی ہے
ہے راہرو وہی جو ہر قدم اُچھلتا ہے
سنبھل کے راہ جو چلتا ہی خاک چلتا ہے
وہ مر چکے جو عزیز اپنی زندگی سمجھے
وہی ہے زندہ جو مرنے کو دل لگی سمجھے

نہیں اگر کوئی سودا تو سر بھی کیا سر ہے
جو دل ہے جوش سے خالی وہ خاک پتھر ہے

ہے اپنی رائے ذرا مختلف زمانے سے
غلط روی کہیں بہتر ہے ڈھیر جانے سے

نثار سجدۂ شکر اس کی بے نیازی پر
جھکے نہ سیلِ حوادث میں بھی کبھی جو سر

جو مشرقی کا تحمّل ہے یا قناعت ہے
خطا معاف ہو یہ موت کی علامت ہے

شباب میں ہے تدبّر تو کفرِ ثانی ہے
جو کھولتا رہے وہ خوں ہے ورنہ پانی ہے

ہمیشہ آگ بھڑکتی رہے جو سینے میں
تو اس لطف بھی آتا رہے گا جینے میں

دورِ زر

اگر عزّت کی خواہش ہے تو دولت پہلے پیدا کر
یہ ظاہر ہے نہ دولت ہو تو پھر عزت نہیں ہوتی

خوشامد کی بدولت بے ہنر ذی رُتبہ بنتے ہیں
ہنرور کس مپرسی میں ہیں کچھ شہرت نہیں ہوتی

اگر زردار بدطینت بھی ہو جھکتے ہیں سر سب کے
مجسم خُلق اگر نادار ہو وقعت نہیں ہوتی

زبانی وعظ اور اُپدیش اکثر ہوتے رہتے ہیں
مگر اس دور میں کچھ پرسشِ سیرت نہیں ہوتی
کوئی نادار کتنی ہی کہے باتیں بلندی کی
مگر اے امن حاصل کوئی اہمیت نہیں ہوتی

مقصدِ حیات!

کسی عالم میں خود کو صاحبِ مقدور پاتا ہوں
کبھی ہستی کو اپنی مطلقاً مجبور پاتا ہوں
ہوا و نار و آب و گِل سے ہے اپنا خمیر آخر
مُسلّط زیست پر ہو کیسے فرمانِ ضمیر آخر
ضمیر اخلاق کا حامی ہے لیکن وہ بنا کیونکر
ہوا ہے منعکِس ماحول ہر انساں کی ہستی پر

بہت کچھ امتیازِ نیک و بد انسان کرتا ہے
اصولاً نیکیوں کے حق میں ہی بدیوں سے ڈرتا ہے
مگر کیا نیک ہے کیا بد ابھی تک یہ معمّا ہے
یہ ایسا مسئلہ ہے جو نہ سلجھے گا نہ سلجھا ہے
جو رازِ آفرینش کھل سکے تو حال ظاہر ہو
مگر انسان کا مقدور کیا جو اِس کا ماہر ہو
ازل مستور ہے ہم سے ابد مستور ہی ہم سے
حقیقت کی شناسائی نہایت دور ہی ہم سے
جھکی جاتی ہیں نظریں اُن کی جو اہلِ نظر ٹھہرے
نہ ٹھہرے آنکھ جب جا کس طرح اُس جا بشر ٹھہرے

کچھ نہیں معلوم

کس منزل پر لے جائے گا مجھ کو یہ دِل معلوم نہیں
چلتا ہوں اشاروں پر اِس کے لیکن منزل معلوم نہیں
موجوں کے تھپیڑوں پر پیہم تنکا سا بہتا جاتا ہوں
ساحل کی طرف کیا خاک بڑھوں سمتِ ساحل معلوم نہیں
معنی کیسے مطلب کیسا منزل کیسی مقصد کیسا
جیتا ہوں فقط جینے کے لئے اس کا حاصل معلوم نہیں

یہ کھٹکا سا کیا ہے آخر میں جس کے سہارے جیتا ہوں
حالِ دُنیا معلوم ہو گیا، جب حالِ دل معلوم نہیں

یہ رنگینی یہ رنگینی یہ رنگینی اللہ اللہ
کس طرح مِلائے ہیں باہم یہ آب و گِلِ معلوم نہیں

ہر آسانی میں دشواری، ہر دشواری میں آسانی
اے احسنؔ یہاں کیا آساں ہے کیا ہی مشکل معلوم نہیں

مہاتما گاندھی
کے
ایک جملہ سے متاثر ہو کر

لالہ دیش بندھو گپتا نے تیج کے کرشن نمبر کے لئے پیغام طلب کیا تو مہاتما گاندھی نے لکھا " بھائی دیش بندھو مجھ سے سندیش کیا مانگتے ہو میں سوکھ گیا ہوں "

بظاہر گو کہ تو برہم زنِ صد سازِ محفل ہے
مگر تخریب میں بھی پہلوئے تعمیر شامل ہے
سکوں پرور یہ کیا ہنگامہ تو نے کر دیا برپا
کہیں دار و رسن ہیں اور کہیں شورِ سلاسل ہے

ترے ہی دم سے یہ دم خم ہوئے ہیں ہندوالوں کے
جو ہر مشکل پہ کہتے ہیں کہ یہ بھی کوئی مشکل ہے

یہ مانا دُور ہے منزل مگر کیا کم ہے اتنا بھی
کہ تیری ذات سے ہم کو اُمیدِ قربِ منزل ہے

فسردہ ہو گیا ہوں میں یہ آخر کیا کہا تو نے
قسم ہے تیری عظمت کی کہ تو ہی جانِ محفل ہے

یہاں تک ہو گیا تو بے نیازِ ثمرۂ محنت
کہ تجھ کو سعیِ لاحاصل میں بھی اک لطف حاصل ہے

ترے مشرب میں درجہ کفر کا رکھتی ہے مایوسی
اُمیدوں کا تسلسل بندگیِ حق میں شامل ہے

تلاطم کی نہیں پرواہ شناور ہو تو ایسا ہو
ہر اک موجِ مخالف تجھ کو پا اندازِ ساحل ہے

خصوصیت یہی یہ تیری کہ میدانِ سیاست میں

تجھے ہر ہر قدم پہ امتیازِ حق و باطل ہے

وفا کی رسم آئینِ جہاں سے ہو چکی خارج

تعجب ہے کہ اب تک نہ تری فطرت میں داخل ہے

کروں توہین کیوں تیری فرشتہ کہہ کے میں تجھ کو

تکلف برطرف تو سر بسر انسانِ کامل ہے

جو ظاہر بیں ہیں کیا جانیں وہ قدر و منزلت تیری

کہ جنسِ بے بہا گاندھی ترا لوٹا ہوا دل ہے

لکھی یہ نظم اِک مدّاح نے فرطِ عقیدت سے

نہ ہے جوشِ عمل جس میں نہ تیرے در کے قابل ہے

جنوں کی ضرورت

عقل نے مکر و فریب اکثر سِکھایا ہے ہمیں
درس کذب و زُور کا پیہم پڑھایا ہے ہمیں
ہاں خردِ نے اپنا دیوانہ بنایا ہے ہمیں
دل کی قوت کا یقیں آئے نہ آیا ہے ہمیں

ہر بشر دنیا میں عقل و ہوش کا بیمار ہے

عقل کا ہے یہ تقاضا پھونک کر رکھو قدم
اپنی حد سے بڑھ کے کیا پاؤ گے جز رنج والم
اس تعین نے کیا سب کو اسیرِ بندِ غم
عقل کی سرحد سے گذرو کیا ہی فکرِ بیش و کم
زندگی اس دورِ عقل و ہوش میں دشوار ہے
اک جنوں تھا جس نے قوموں کو اٹھایا خاک سے
وہ جو ڈرتے تھے نظر آنے لگے بیباک سے
جذبِ دل نے ہی گذارا سرحدِ ادراک سے
کان میں آئیں صدائیں یہ سرِ افلاک سے
مستیوں کا لے سہارا تیرا بیڑا پار ہے
خفتگانِ دورِ دانش کو جگانے کے لئے
یاس کو ہر آنکھ ہر دل سے ہٹانے کے لئے

زندگی کو باعمل رنگیں بنانے کے لئے
اک تلاطم دہرِ بےحس میں مچانے کے لئے
اک جنوں درکار تھا، ہاں اک جنوں درکار ہے

انقلاباتِ جہاں کے جو کہ لشکر بانی ہوئے
دہر پر سکہ بٹھانے میں جو لاثانی ہوئے
شمعِ روشن جو میانِ بزمِ امکانی ہوئے
اک جنونِ پختہ سے تصویرِ قربانی ہوئے
آج تک اُن کے جنوں کی گرمیِ بازار ہے

---

۳۵ سنہ ء کا آئین منظور ہونے پر

وہ دے رہے ہیں بہ ظاہر جو اختیار مجھے
غرض یہ ہے کہ کریں اور زیر بار مجھے
یہ اور بات ہے کھُل کر نہ کہہ سکوں ورنہ
نہیں ہے آپ کے وعدوں پر اعتبار مجھے
دلیلِ پستیِ شوق اِس کو میں سمجھتا ہوں
رہِ طلب میں جو ہے تابِ انتظار مجھے

قصور یہ ہے کہ محکوم رہ کے جیتا ہوں
سمجھ رہا ہے زمانہ ذلیل و خوار مجھے

میں اپنے حال سے دُنیا کو باخبر کردوں
اجازت اتنی تو دیدے ستم شعار مجھے

جو اُس پاس ہے سب ملکیت ہی غیروں کی
دیارِ غیر ہوا ہے مرا دیار مجھے

اسیرِ زلفِ صنم ہوں نہ بادہ خوار ہوں امنؔ
کرے گا کیوں شعرا میں کوئی شمار مجھے





نوائے آزادی

عجیب لوگ ہیں یہ حرّیت کے دیوانے
جو قید خانے کو سمجھے مکانِ آزادی

اندھیری رہتی ہے دائم غلام کی دنیا
تجلّیات سے پُر ہے جہانِ آزادی

جو سو رہے تھے وہ سب جاگ اٹھے اچٹ گئی نیند
جو ہم سُنانے لگے داستانِ آزادی

بہ یک نگاہ بہ یک لفظ کردہ اعجازے
غلامِ ہمتِ آں پاسبانِ آزادی